مکالمے کا قتل

(کہانیاں)

کے اشرف

جملہ حقوق بحقِ خواجہ اشرف محفوظ ہیں

ISBN: 978-1-4507-5703-4

کتاب : مکالمے کا قتل (کہانیاں)

مصنف : کے اشرف

سرورق : چارلس کینٹز

سال اشاعت : 2011

تعداد اشاعت : 1000

مطبع : مطبوعات پبلشرز

قیمت : 300روپے

مطبوعات پبلشرز، 696جی، جوہر ٹاؤن، لاہور

انتساب

دنیا بھر میں حریتِ فکر کے علم برداروں کے نام

ترتیب

اظہارِ تشکر ---------- 7

پیش گفتار ---------- 9

پنشن ---------- 11

اعلانِ جنگ ---------- 17

خدا کیسے خوش ہوتا ہے ---------- 21

اونٹ اور بدو ---------- 25

ہوا نے سب کو بتا دیا ہے ---------- 31

شیطان ---------- 37

کرشنا ---------- 43

بدھا کے ساتھ چائے کا ایک کپ ---------- 49

مولانا ---------- 55

دلدل ---------- 61

شہزادی ---------- 67

منڈی ---------- 73

چند دوزخیوں سے ملاقات ---------- 79

مکالمے کا قتل ---------- 85

کریم آغا ---------- 93

افیونی ---------- 101

بوجھ -- 107
درخت پر رکھی آنکھیں -- 115
سرخ گلاب -- 119
گول میز کانفرنس --- 123
آزادی --- 127
ردّی کاغذ کا ٹکڑا --- 131
کچھ مصنف کے بارے میں -- 139

اظہارِ تشکر

کس کس کا شکریہ ادا کروں۔ لکھنے لکھانے کے اس سفر میں اتنے دوستوں کی محبت اور معاونت حاصل رہی کہ اس مختصر اظہاریئے میں ان سب کا ذکر ممکن نہیں۔ بہر حال میں ان سب دوستوں کا ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے کسی حوالے سے بھی میرے اس تخلیقی عمل میں میری معاونت فرمائی۔ ان کی محبت اور معاونت کے بغیر یہ سفر جاری رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس سفر میں مجھے ان کی محبت اور تعاون مسلسل حاصل رہے گا۔ کیونکہ یہ کام ان کی معاونت کے بغیر جاری نہیں رہ سکتا۔

پیش گفتار

مختصر کہانیوں کا ایک اور مجموعہ "اور کہانیاں" کے عنوان سے پیش خدمت ہے۔ توقع ہے کہ میری دیگر کہانیوں کی طرح آپ کو یہ کہانیاں بھی پسند آئیں گی۔

میری کہانیوں میں کچھ موضوعات روائیتی سوچوں سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ جن سے قارئین کی سوچوں میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ ان کہانیوں کا مقصد قارئین کو فکری جھٹکے دینا نہیں بلکہ سوچ کے ان زاویوں سے متعارف کرانا ہے جو ہمارے روائتی فکری سانچوں میں فٹ نہیں ہوتے۔ ان میں سے کئی کہانیاں میری ذاتی مذہبی سوچ کی نمائندگی نہیں کرتیں۔

میں بنیادی طور پر اپنے آپ کو ایک کہانی نگار کے طور پر دیکھتا ہوں۔ ایک ایسا کہانی نگار جس کے دروازے پر کچھ ایسی کہانیاں دستک دیتی ہیں جو عام سوچ سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔ میں ان کہانیوں کو ردّ کرنے کی بجائے ایک سچے کہانی نگار کی طرح احاطہِ تحریر میں لاتا ہوں۔

ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک زندگی پر کسی ایک خاص عقیدے، نظریئے یا نقطہِ نظر کا حق یا اجارہ داری نہیں ہے۔

زندگی ایک ایسا عمل ہے جو کئی متضاد اور باہم دگر مخالف قوتوں کی باہمی کشمکش یا تعاون سے جاری رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ زندگی کی اس کشمکش میں سے کوئی ایک قوت ہمیشہ کے لئے باہر ہو جائے گی تو یہ اُس شخص کی کج فکری اور خام خیالی ہے۔

اسی وجہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ متضاد نظریاتی قوتوں کو ایک دوسرے کے قتل وغارت کی بجائے بقائے باہمی کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنے اپنے دائرہ عمل میں زندہ رہنے کا حق دینا چاہئے۔ یہی وہ اصول ہے جس پر چل کر انسانیت اپنے لئے زندگی کے بہترین امکانات کے دروازے کھول سکتی ہے۔

کیونکہ فن کی مختلف صورتیں انسانی شعور پر اثر انداز ہونے کی بے پناہ قوت رکھتی ہیں اس لئے فن کاروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے بقائے باہمی کے اصول کی ترویج و اشاعت کریں۔ شاعروں اور ادیبوں کو بھی اس سے استثنا حاصل نہیں۔

ادبی فن پارے بھی انسانی سوچوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے شاعروں اور ادیبوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے فن پاروں کے ذریعے زندگی کی باہم دگر متخالف قوتوں میں بقائے باہمی کے اصول کے تحت زندگی کے عمل کو جاری و ساری رہنے کے نئے امکانات کے لئے نئے در وا کریں۔

کہانیاں آپ کو اچھی لگیں یا بُری۔ ازراہ کرم مجھے اپنے تاثرات سے ضرور آگاہ کریں۔ مجھے ان کہانیوں کے بارے میں آپ کی آراَ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

کے اشرف
1375یونیورسٹی ایونیو
برکلے، کیلیفورنیا94702
یوایس اے
ای میل: kashraf@ix.netcom.com

پنشن

وہ دیر تک سڑک پر کھڑا آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اُسے لگا کہ یہ لوگ پہلے جیسے نہیں رہے۔ اب ان میں پہلے سے کچھ مختلف تھا۔ لیکن کیا مختلف تھا اس کا اندازہ لگانے کے لئے اُسے کچھ انتظار کرنا پڑا۔

اس انتظار میں اُس کا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ یہ بھول بھلیاں کہاں سے شروع ہوتی تھیں اور کہاں ختم اس کا اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ گاؤں کیا تھا بس چند سو گھروں کا مجموعہ تھا۔ جس کے ارد گرد چاروں طرف کھیت تھے۔ دو طرف سیلابی ندیاں تھیں اور دو طرف نہریں۔

یہ نہریں اور سیلابی ندیاں گوروں نے بنائی تھیں۔ گوروں کا خیال آتے ہی اُس کا ذہن مال روڈ کی طرف مڑ گیا۔ مال روڈ بھی تو گوروں نے بنایا تھا۔ اور مال روڈ کے ارد گرد پھیلی عمارتیں۔ ہائی کورٹ، گورنمنٹ کالج، جی پی او اور میوزیم۔ کتنی عمارتیں تھیں جو گوروں کے جانے کے بعد بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ مال روڈ پر آتے جاتے لوگوں کو اپنے بنانے والوں کی یاد دلاتی رہتی تھیں۔

مال روڈ کی عمارتوں کے بعد اُس کا ذہن پھر گاؤں کی طرف چلا گیا۔ چاچا کریم دارے میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ وہ چاچے کریم کے پاس نیچے سروٹ کی بنی ایک چٹائی پر بیٹھا تھا۔

"بیٹا گورے بہت اچھے لوگ تھے۔ وہ ہمیشہ ایسے کام کرتے تھے جن سے عام لوگوں کی بھلائی ہوتی تھی۔ ان کے برعکس مسلمان بادشاہ ہمیشہ اپنے لئے محلات اور بارہ دریاں بناتے تھے۔"

چاچا کریم ان پڑھ آدمی تھا۔ جوانی میں ریلوے میں ملازم تھا۔ اب اسے ریلوے سے پنتیس روپے پنشن ملتی تھی۔ اس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سب کے سب شادی شدہ تھے۔ بیٹے تو اس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ لیکن بیٹی قریبی گاؤں میں بیاہی تھی۔

وہ سردیوں گرمیوں میں سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ گھر سے چارپائی اٹھائے دارے میں آتا اور سورج کی آخری کرنوں تک وہیں بیٹھا حقہ پیتا اور آنے جانے والوں کے ساتھ گپ شپ کرتا۔

سردیوں میں وہ اپنی چارپائی ایسی جگہ جماتا جہاں دھوپ براہ راست پڑتی۔ جیسے جیسے دن گرم ہوتا اس کی چارپائی دھوپ سے درختوں کے سائے کی طرف سرکتی جاتی۔

گرمیوں میں وہ اپنی چارپائی درختوں کی چھاؤں میں بچھاتا۔ زیادہ گرمی ہوتی تو اپنا کرتا اتار لیتا۔ ورنہ کھلے میں ہونے کی وجہ سے کرتے میں ہونے کے باوجود ٹھنڈی ہوا کے مزے لوٹتا اور حقہ گڑگڑاتا رہتا۔

کاما صبح سکول جاتا تو دور سے چاچے کریمے کو سلام کرتا۔ چاچا بہت کہتا کہ وہ چند لمحے اُس کے پاس رک جائے لیکن وہ بغیر چاچے کریمے کے پاس رکے سکول چلا جاتا۔ تاہم سکول سے واپسی پر وہ فوراً سکول سے ملے گھر کے کام والی کتابیں اٹھا کر دارے میں چاچے کریمے کے پاس چلا آتا۔

وہ چاچے کے پاس بچھی چٹائی پر اپنی کتابیں رکھ کے سکول کا کام کرنا شروع ہو جاتا۔ کام کے ساتھ ساتھ اُس کی چاچے کے ساتھ گفتگو چلتی رہتی۔

چاچا جب بھی گوروں کی بات کرتا وہ ہمیشہ چاچے کو تنگ کرتا:

"چاچا اگر گورے اتنے اچھے تھے تو تم گوروں کے ساتھ اُن کے دیس کیوں نہ چلے گئے۔ یہاں دارے میں بیٹھنے کی بجائے لندن میں کسی پارک میں بیٹھ کر حقہ پیتے۔"

"اوئے کامے۔ تمیں کیا پتہ کہ گورے کتنے اچھے لوگ تھے۔ اب دیکھو ناں۔ اُنہوں نے کیسا انتظام کیا تھا۔ میں ریلوے میں معمولی ملازم تھا۔ ریل کی پٹڑیوں پر صاحب کی ٹرالی دوڑاتا تھا۔ ساری عمر ٹرالی دوڑائی۔ ہمیشہ صحت مند رہا۔ کوئی بیماری قریب نہیں آئی۔ اب پچاسی برس کا ہو کر بھی نوجوانوں سے پنجہ لڑاتا ہوں۔ دن بھر حقہ پیتا ہوں۔ عزت سے بڑھاپا کاٹ رہا ہوں۔ پینتیس روپوں میں میرا اور تمہاری چاچی کا اب بھی اچھا گزارہ ہوتا ہے۔ جب سے پاکستان بنا ہے اور گوروں کی جگہ کالے انگریز حکمران ہوئے ہیں کوئی چیز ٹھیک نہیں۔"

پھر سڑک پر کھڑے کھڑے اس کا ذہن چاچے کریمے سے سڑک پر دوڑتی گاڑیوں کی طرف مڑ جاتا۔ دھواں چھوڑتی گاڑیاں، ویگنیں، رکشے، موٹر سائیکلیں اور انسانی ٹانگوں سے چلتے سائیکل اندھا دھند سڑک پر دوڑتے چلے جاتے۔ وہ سب پریشان حال کسی نہ کسی سمت بھاگتے دکھائی دیتے۔

"یہ سب کیوں پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ آخر یہ تھوڑی دیر رک کر، بس تھوڑی دیر، کہیں بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔ کہیں بیٹھ کر حقہ کیوں نہیں پیتے۔ گپ شپ کیوں نہیں کرتے۔"

حقے کی نے کی گڑگڑاہٹ کے پیچھے اُسے پھر چاچے کریمے کی آواز سنائی دیتی۔

"اگر گورے ہندوستان نہ آتے۔ تو نہ ریلوے لائن ہوتی۔ نہ اسکول ہوتے۔ نہ کالج بنتے۔ نہ لڑکے لڑکیاں تعلیم پاتے۔ اور نہ مجھے پینتیس روپے ماہانہ پنشن ملتی۔ میں فراغت سے دارے میں بیٹھ کر حقہ پینے کی بجائے کسی آڑھت پر بوریاں اٹھاتے اپنی کمر تڑوا کر کب کا مر کھپ چکا ہوتا۔"

چاچے کریمے کی باتیں سُن کر اُسے لگتا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن گورے غیر ملکی حکمران تھے۔ وہ ہندوستان پر قابض تھے۔ اُنہوں نے ہندوستان فتح کیا تھا۔ سارے ہندوستانی اُن کے غلام تھے۔ گوروں کے جانے کے بعد ہندوستانی بھی آزاد ہیں اور پاکستانی بھی۔

ہندوستانی آزادی کے بعد کس حال میں ہیں۔ اس کا تو اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ لیکن پاکستانی یقناً بیمار ہیں۔ سب کے سب۔ اوپر سے نیچے تک۔ اوپر والے زیادتیاں کرتے ہیں اور نیچے والے زیادتیاں برداشت کرتے ہیں۔ اوپر والوں کو زیادتیاں کرتے شرم نہیں آتی اور نیچے والوں کی زیادتیاں سہتے غیرت نہیں جاگتی۔ عزت اور غیرت کی اوٹ سے اُسے پھر چاچے کریمے کے حقے کی گڑگڑاہٹ سُنائی دی۔

ایک دن دارے میں بیٹھے چاچے کریمے نے اُسے اپنے ہی گاؤں کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ گاؤں کے چوہدری نے اپنے ہی ایک کمی کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

کمی نے گورے صاحب سے روتے ہوئے انصاف کی درخواست کی تھی۔ گورے صاحب نے گاؤں آکر سارے گاؤں میں پنچایت لگائی۔ اس نے سارے گاؤں والوں سے پوچھا تھا کہ چوہدری کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

سارے گاؤں کا فیصلہ تھا کہ چوہدری کی کمی کی بیٹی سے شادی کر دی جائے۔ ساری زمین اُس کے نام کی جائے اور وہ باقی کی ساری زندگی اُس کا وفادار شوہر بن کر کاٹے۔

گورے صاحب نے وہیں پٹواری کو بلا کر چوہدری کی زمین کمی کی بیٹی کے نام کی۔ مولوی صاحب کو بلا کر چوہدری کا نکاح اس کے ساتھ پڑھوایا۔ چوہدری کی ساری اولاد اسی کمی کی بیٹی سے پیدا ہوئی۔ کسی نے علی گڑھ سے بی اے کیا اور اب اپنے نام کے ساتھ علیگ لکھتا ہے اور کسی نے کے ای کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور اب وہ ڈاکٹر ہے۔

اب کالے انگریزوں کے زمانے میں روز لوگ مر رہے ہیں۔ کوئی بھوک سے۔ کوئی ننگ سے۔ نہ مرنے والوں کو شرم آتی ہے۔ نہ ان کو جن کی وجہ سے مر رہے ہیں۔

وہ سڑک کے کنارے کھڑا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ گاڑیاں، ویگنیں اور رکشے اب بھی پوری رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔ ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس بے تحاشہ دوڑ کے باوجود منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی تھی۔ اس قدر تیز رفتاری کے باوجود منظر اسی طرح ایک جگہ ٹھہرا تھا۔ گاڑیاں، ویگنیں اور رکشے بدل رہے تھے لیکن منظر۔۔۔ آخر منظر کے ٹھہراؤ سے اُس کی آنکھیں پتھرانا شروع ہو گئیں۔ اُس نے چند لمحوں کے لئے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی آنکھوں کو پتھرانے سے روکنا چاہا لیکن اس فضول حرکت سے اُسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ گاڑیاں، ویگنیں اور رکشے اسی طرح بھاگتے رہے لیکن منظر اسی طرح ٹھہرا رہا۔ اُس کی آنکھیں اسی طرح پتھرائی رہیں۔ جامد و ساکت کسی تبدیلی کے احساس کے بغیر۔

ایک دھواں چھوڑتی ویگن کا دھواں اُس کے نتھنوں میں گھسا تو اُسے پھر چاچا کریما یاد آیا:

"یہ بد بخت کوئی کام ٹھیک نہیں کر سکتے۔ کامے ہم تو گاؤں میں رہتے ہیں۔ تم لاہور جاؤ گے تو دیکھو گے کہ گوروں نے کتنا خوبصورت شہر بنایا تھا اور اب اِن کالے انگریزوں نے اِس شہر کا کیا حال کیا ہے۔"

"لیکن چاچا لاہور میں تو شاہی قلعہ ہے۔ بادشاہی مسجد ہے۔ شالیمار ہے۔ بارہ دریاں ہیں۔ سب مُغلوں نے بنائی تھیں۔" اُس نے چاچے کریمے کو لقمہ دینے کی کوشش کی۔

چاچے نے حقہ گڑ گڑاتے ہوئے اُسے جواب دیا: "قلعہ بادشاہوں نے اپنے لئے بنایا تھا۔ لیکن اب یہ مختلف سوچ رکھنے والوں کی دماغی اصلاح کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بارہ دریاں اور شالیمار بھی انہوں نے اپنے لئے بنائے تھے۔ اور بادشاہی مسجد لوگوں کو یہ یاد دلانے کے لئے بنائی تھی کہ بادلوں سے اوپر، ستاروں کے اُس پار، آسمانوں سے ماورا ایک عرش ہے اور عرش پر ایک خدا بیٹھا ہے جس کا سایہ بادشاہ سلامت ہے۔ پانچ وقت اُس عرش پر بیٹھے خدا کے لئے زمین پر سر رکھنا اِس لئے ضروری ہے کہ اُن کا سر ہمیشہ بادشاہ کے سامنا جھکا رہے جو اِس زمین پر اُس خدا کا سایہ ہے۔"

اُس کی پتھرائی آنکھیں ٹھہرے منظر میں سڑک پر دوڑتی گاڑیاں، ویگنیں، رکشے اور سائیکلیں دیکھتی رہیں لیکن اس کا ذہن مسلسل چاچے کریمے کے ساتھ مکالمے میں مصروف رہا۔ چاچا مسلمان بادشاہوں سے پھر گوروں کی طرف لوٹ آیا تھا۔

"گورے اب بھی اپنے ملکوں میں ہر کام کرنے سے پہلے اپنے عوام کا مفاد دیکھتے ہیں۔ اُن کی ساری تگ و دو، سوچ و بچار اور بحث مباحثہ اِس لئے ہوتا ہے کہ اپنے لوگوں کو کیسے فائدہ پہنچایا جائے۔ اُن کی زندگی میں کیسے بہتری لائی جائے لیکن اُن کے یہ کالے نائبین ہر کام کرنے سے پہلے سوچتے ہیں کہ اِس میں اُن کا کتنا فائدہ ہے۔"

"چاچا۔ پلیز تم گوروں کو یاد کرنا چھوڑ دو۔ اب تمہاری پنشن کے پنتیس روپے لندن سے نہیں آتے۔ حکومت پاکستان کے خزانے سے آتے ہیں۔"

"خزانہ۔۔۔"

اُس کے منہ سے خزانے کا لفظ سن کر چاچے کے حقے کی گڑ گڑاہٹ تیز ہو گئی۔ دارے میں ہوا تیزی کے ساتھ چلنا شروع ہو گئی۔ چاچے نے اپنی قمیض پہن لی۔

سڑک پر گاڑیاں، ویگنیں، رکشے اور سائیکلیں پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے لیکن منظر اُسی طرح ٹھہرا رہا۔ اِس دوران کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اُس نے پتھرائی آنکھوں سے دیکھا اُس کے گاؤں کا ایک شخص اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ وہ گامے موچی کا بیٹا للّو تھا۔

"للّو تم۔۔۔ کب آئے ہو گاؤں سے؟" کامے نے گامے موچی کے بیٹے للّو کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا گاؤں میں سب ٹھیک ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ صرف چاچا کریما فوت ہو گیا ہے۔ دارے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ڈاکیئے نے خط لا کر دیا۔ اس نے پڑھنے کے لئے کہا۔ سرکاری خط تھا۔ خط میں لکھا تھا۔ حکومت کا خزانہ خالی ہو چکا ہے۔ اب اُس کو ادا کرنے کے لئے حکومت کے پاس پنتیس روپے نہیں۔ اُس نے خط سنا۔ حقے کا لمبا کش لیا۔ اور یہ کہہ کر چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں مُوند لیں کہ جن کالے گوروں کے دیس کے خزانے میں ادا کرنے کے لئے پنشن کے پنتیس روپے نہ ہوں وہاں جی کے کیا کرنا۔"

گاڑیاں، ویگنیں، رکشے اور سائیکلیں سڑک پر ویسے ہی دوڑ رہی تھیں۔ لیکن منظر اُسی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ للّو کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چل دیا۔

اُس کا دل بوجھل تھا۔ چاچے کریمے کے بغیر گاؤں کا دارہ کتنا خالی ہو گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ پھر اُس نے دیکھا چاچا کریما اب بھی دارے میں چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑ گڑا رہا تھا۔

"گورے کتنے اچھے لوگ تھے۔ وہ ہر کام لوگوں کے لئے کرتے تھے۔ اور یہ کالے انگریز۔۔۔۔" وہ کہہ رہا تھا۔

اعلانِ جنگ

کئی دنوں سے اُس کا معمول تھا کہ وہ صبح سو کر اٹھتا تو پہلے مشرق کی طرف منہ کر کے خدا کو ایک موٹی سی گالی دیتا۔ اس کے بعد مغرب کی طرف منہ کرتا اور شیطان کو ایک موٹی سی گالی دیتا۔

خدا اُس کی گالی سُن کر ہمیشہ خاموش رہتا۔ شیطان خدا کو خاموش دیکھتا تو چادر لپیٹ کر دوبارہ آنکھیں مُوند لیتا۔ "اگر خدا اِس کی گالیوں پر ردِ عمل ظاہر نہیں کر رہا تو مجھے اِس کی گالیوں کا جواب دینے کی کیا ضرورت ہے۔" شیطان لیٹے لیٹے سوچتا۔

کئی دنوں تک اُس کی گالیاں سننے کے بعد ایک دن خدا نے فیصلہ کیا کہ وہ اُس سے گالیاں دینے کا سبب پوچھے گا۔ چنانچہ اُس دن اُس نے اُس سے گالی سنی تو اُس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آج صبح وہ اِس قدر ناراض کیوں ہے؟" خدا کا سوال سُن کر اُس نے خشمگیں نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر کہا: "وہ اُس سے سخت بے زار ہے اور آج کے بعد اُس کا نام نہیں سننا چاہتا۔"

خدا نے حوصلے اور صبر کے ساتھ اُس کی بات سُنی اور پھر اُس سے پوچھا کہ " آخر اُس نے ایسا کیا کیا ہے کہ وہ اُس کا نام نہیں سننا چاہتا۔"

اُس نے جواب میں کہا "اُس نے آخر ایسا کیا کیا ہے کہ وہ اُس کا نام عزت اور احترام سے لے؟" خدا نے اُس کی بات سُنی تو مسکراتے ہوئے کہا:

" اُس نے اُسے پیدا کیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہ کچھ نہیں تھا۔ پھر اُس نے اُسے جیتا جاگتا انسان بنایا۔ چلنے پھرنے کے لیے پاؤں دیئے۔ کام کرنے کے لیے ہاتھ دیئے۔ سوچنے کے لیئے دماغ دیا۔ دیکھنے کے لیے آنکھیں دیں۔ محبت کرنے کے لیئے دل دیا۔۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔۔"

"اور کیا۔۔۔۔؟" اُس نے ترش لہجے میں خدا کا منہ چڑاتے ہوئے پوچھا۔

"خیر جانے دو۔ میں نے تمہیں اتنا کچھ دیا اور تمہارے لئے اتنی نعمتیں پیدا کیں کہ تم گننا چاہو تو گن نہ سکو اور شکریہ ادا کرنا چاہو تو شکریہ ادا نہ کر سکو۔"

وہ خدا کا جواب سُن کر کچھ نرم پڑا۔ اُس کے لہجے کی ترشی کچھ کم ہوئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا: " ٹھیک ہے میں مانتا ہوں تم نے مجھے پیدا کیا، چلنے پھرنے کے لئے پاؤں دیئے، کام کرنے کے لیے ہاتھ دیئے، سوچنے کے لیئے دماغ دیا، دیکھنے کے لیے آنکھیں دیں اور محبت کرنے کے لیے دل دیا۔۔۔ اور۔۔۔ اور"

ابھی اُس نے خدا سے اتنی بات ہی کی تھی کہ دوسری طرف شیطان نے لیٹے لیٹے چادر سے منہ نکال کر آنکھیں ملتے ہوئے اُسے کہا:

"تم مجھے بھی روزانہ گالیاں دیتے ہو۔ آج تک میں نے تمہیں جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اب خدا نے تمہاری گالیوں کے جواب میں اپنی نعمتوں کا کھاتا کھول دیا ہے تو میں اِس میں تھوڑی سی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے شیطان کی بات سُن کر خدا کی طرف سے منہ موڑ کر اُس کی بات سننے کی کوشش کی تو خدا نے اُسے روکا کہ وہ اُس کی طرف توجہ نہ کرے۔ لیکن اُس نے خدا کی بات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے شیطان سے کہا اگر وہ خدا کے کھاتے سے اتنا ہی پریشان ہے تو وہ بھی اپنا کھاتا کھول لے۔

شیطان نے اُس کی بات سُن کر مسکراتے ہوئے کہا: "وہ ٹھیک کہتا ہے۔ وہ تمہیں عدم سے وجود میں لایا۔ اُس نے تمہیں چلنے کے لیے پاؤں، کام کرنے کے لیے ہاتھ، سوچنے کے لیے دماغ، دیکھنے کے لیے آنکھیں اور محبت کرنے کے لیے دل دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے تمہارے قدموں کو حرکت، ہاتھوں کو طاقت، دماغ کو متنوع طور پر سوچنے کی صلاحیت اور آنکھوں کو مختلف رنگ دیکھنے کی صلاحیت دی۔ جہاں تک محبت کرنے والے دل کا تعلق ہے محبت میں بھی لذت اور چاشنی میری وجہ سے ہے۔ محبت سے لذت اور چاشنی نکل جائے تو دل صرف خون پمپ کرنے والا آلہ رہ جاتا ہے۔ محبت سے اُس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔"

اُس نے شیطان کی بات سُن کر ایک نظر خدا کی طرف دیکھا۔ خدا نے کہا: "یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ صرف تمہیں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ پیروں کی حرکت، ہاتھوں میں کام کرنے کی طاقت، دماغ کی سوچنے کی صلاحیت، آنکھوں میں دیکھنے کی روشنی سب اِن اعضا کی اپنی خصوصیات ہیں۔ اُس لعین کا اِس میں سے کسی چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

شیطان نے اُسے خدا کی بات توجہ سے سُنتے دیکھا تو اپنی چادر ایک طرف پھینک کر کھڑا ہو گیا اور تن کر کہنے لگا: "یہ مجھے جھوٹا کہتا ہے۔ اِسے پوچھو اِس نے میرے خلاف کب سے اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ اِس جنگ میں لاکھوں کروڑوں انسان قتل ہو چکے ہیں۔ ابھی تک اِس کا غصہ کم نہیں ہوا۔ نہ جانے اور کتنے لوگ اِس کی اِس جنگ کا ایندھن بنیں گے۔ انسانوں کی دنیا میں سارے مصائب اِس کی وجہ سے ہیں۔ جب تک اِس کا میرے خلاف جنگ کا جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوتا انسان اِسی طرح تباہ و برباد ہوتے رہیں گے۔ انسانوں کو اِس کے چنگل سے نکلنا ہو گا۔ اُنہیں اِس سے نجات پانا ہو گی۔"

شیطان کی تقریر سُن کر خدا بھی جوش میں آ گیا۔ وہ بھی اُسی طرح تن کر کہنے لگا: "یہ مجھ پر جنگ کا الزام لگاتا ہے۔ اِسے پوچھو اِس دنیا میں سارے فتنے کس کی وجہ سے ہیں۔ میں جہاں جاتا ہوں۔ یہ پہلے وہاں پہنچ کر اپنا ٹینٹ لگا لیتا ہے۔ اور لوگوں کو میرے خلاف اکسانے لگتا ہے۔"

اب تک خدا اُس کے مشرق اور شیطان مغرب کی طرف کھڑا تھا۔ وہ دونوں باری باری بول رہے تھے۔ وہ درمیان میں کھڑا اُن کا مکالمہ سن رہا تھا۔

خدا بولتا تو وہ اپنا دھیان اُس کی طرف کر لیتا۔ شیطان بولتا تو وہ اپنی پوری توجہ اُس پر مرکوز کر دیتا۔ پھر یوں ہوا کہ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف بیک وقت بولنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے پر چیخ چیخ کر الزامات لگانا شروع ہو گئے۔

اُس نے دونوں کو ہاتھوں کے اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ لیکن وہ دونوں مسلسل چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔ خدا کے ذہن میں جو آتا تھا شیطان سے کہے جا رہا تھا۔ شیطان بھی اُسے ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ نہ خدا چپ ہو رہا تھا نہ شیطان۔

آخر تنگ آ کر اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے۔ لیکن وہ دونوں اتنی اونچی آواز سے چیخ رہے تھے کہ ہاتھوں سے کان بند کرنے کے باوجود اُن کی آواز اُس کے کانوں کے پردے چیر کر اُس کے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔

خدا اُسے کہہ رہا تھا کہ اُس کے سب مسائل شیطان کی وجہ سے ہیں۔ اُسے چاہئے وہ شیطان کے خلاف جنگ کرے۔ شیطان اُسے کہہ رہا تھا کہ اُس کے سب مسائل خدا کی وجہ سے ہیں وہ خدا کے خلاف جنگ کرے۔ جب کانوں پر ہاتھ رکھنے سے بھی وہ اُن کی آواز روکنے میں ناکام ہو گیا اور اُن دونوں کے چیخنے سے اُس کا دماغ پھٹنے لگا تو اُس نے منہ مشرق کی طرف کر کے پہلے خدا کو اور پھر منہ مغرب کی طرف کر کے شیطان کو ایک بڑی سے گالی دی اور دونوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا اُسے ان دونوں میں سے کسی سے کوئی غرض نہیں۔ وہ دونوں کے خلاف جنگ کرے گا۔ وہ نہ خدا کے چکر میں پڑنا چاہتا اور نہ شیطان کے۔

اُس کا اعلانِ جنگ سُن کر خدا اور شیطان نے ایک دوسرے پر چلّانا بند کر دیا اور دونوں قہقہے مار کر ہنسنا شروع ہو گئے۔ اُس نے دیکھا وہ دونوں بے تحاشہ ہنس رہے تھے اور اُن کے قہقہوں کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں کہہ رہے تھے:

"آخر اُس نے اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ ہم دونوں جیت گئے ہیں۔"

خدا کیسے خوش ہوتا ہے؟

خدا کیسے خوش ہوتا ہے؟

اُس نے بہت کوشش کی کہ اِس سوال کا جواب ڈھونڈے لیکن اِس کا جواب نہ اُسے ملنا تھا نہ ملا۔ کبھی اُس نے اِس سوال کا جواب تنہا ڈھونڈا کبھی اور لوگوں کے ساتھ مل کر۔

آخر تنگ آکر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر اُس شخص کے پاس جائے گا جس کا خدا کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی تعلق ہے۔ جو خدا کی بات کرتا ہے یا دعویٰ کرتا ہے کہ اُسے پتہ ہے کہ خدا کو کیسے خوش کیا جا سکتا ہے۔

اِس مقصد کے لئے سب سے پہلے وہ اپنے گاؤں کے مولوی صاحب کے پاس گیا۔ اُس نے آج تک کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ روزہ نہیں رکھا تھا۔ کسی مذہبی اجتماع میں شریک نہیں ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے اُسے اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

اُس نے انتہائی ادب کے ساتھ مولوی صاحب سے سوال کیا وہ جاننا چاہتا ہے کہ خدا کیسے خوش ہوتا ہے تا کہ وہ اُسے خوش کر سکے۔

مولوی صاحب نے حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھا کہ یہ کیسا شخص ہے جو اُن سے پوچھنا چاہتا ہے کہ خدا کیسے خوش ہوتا ہے حالانکہ زیادہ تر لوگ اُن سے نماز، روزے، حج، قربانی، زکواۃ اور شادی بیاہ کے مسائل کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے چند لمحے توقف کیا اور پھر فرمانے لگے کہ خدا احکامِ شریعت کی پابندی سے خوش ہوتا ہے۔ جو لوگ احکامِ شریعت کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ خدا کے محبوب بن جاتے ہیں۔ اُن کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں جنت تیار کر رکھی ہے۔

"اور اگر کوئی احکامِ شریعت کی پابندی نہ کر سکے تو؟" اُس نے پریشان ہوتے ہوئے مولوی صاحب سے پوچھا۔

"اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہنم تیار کر رکھا ہے۔ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے وہ چاہے تو در گزر کرے۔ اور جسے چاہے جنت میں بھیج دے۔"

مولوی صاحب کی بات سُن کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس نے "جہنم، انسان اور پتھر" جیسے الفاظ کو مولوی صاحب کی بات سے منہا کر کے "اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے" پر توجہ دی اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہمیشہ "اللہ غفور الرحیم ہے" پر توجہ دے گا اور جنت کے انعام اور جہنم کی آگ کے بارے میں کبھی نہیں سوچے گا۔

چند دن تک وہ "اللہ غفور الرحیم ہے" کے روح افزا تصور کے ساتھ خوش و خرم اپنے دن گزار تا رہا۔ لیکن پھر اُسے خدا کیسے خوش ہوتا ہے کے سوال نے دوبارہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بظاہر اُس کے ذہن میں مولوی صاحب کی احکامِ شریعت کے بارے میں کہی گئی بات موجود تھی لیکن وہ زندگی میں اتنا سست رو اور کاہل آدمی تھا کہ احکامِ شریعت پر عمل کرنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"اللہ غفور رالرحیم ہے" کے بارے میں اگرچہ اُس کا خیال تھا کہ رحم کرنا اور بخشنا خالصتاً اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے لیکن اس میں اِس بات کا احتمال موجود ہے کہ وہ نہ رحم کرے اور نہ بخشے۔ اس کے علاوہ اس نقطہ نظر میں خدا کی خوشی کو جاننے کا بھی کوئی طریقہ کار موجود نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ مولوی صاحب کی بات چھوڑ کر کسی صوفی سے پوچھے گا کہ وہ خدا کو کیسے خوش کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ کسی صوفی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک دو حضرات کو وہ جانتا تھا جن کے نام کے ساتھ صوفی کا لاحقہ اور سابقہ استعمال ہوتا تھا۔

وہ پہلے صوفی صاحب کے پاس پہنچا تو اُنہوں نے اُس کا سوال سُن کر ایک بڑا سا قہقہہ لگایا: " بھائی میرا نام صوفی مشتاق احمد ہے۔ جس صوفی کی آپ کو تلاش ہے میں وہ صوفی نہیں ہوں۔ صرف میرے نام کے ساتھ صوفی جُڑا ہے۔ اِس کے علاوہ کچھ نہیں۔

وہ اِن صوفی صاحب سے مایوس ہو کر پریشاں حال ایک اور صوفی صاحب کے پاس گیا اُنہوں نے بھی اُسے وہی جواب دیا کہ وہ نام کے صوفی ضرور ہیں لیکن کام کے صوفی نہیں۔

اب اُس کی مایوسی دیدنی تھی۔ اُس نے کچھ لوگوں سے کسی صوفی کے بارے میں پوچھا۔ اُس کے سوال کے جواب میں بہت سے لوگوں نے اُسے بہت سے صوفیوں کے بارے میں بتایا۔ اُن کی خلقِ خدا میں مقبولیت کا ذکر کیا۔ اُن کی کرامات کے بارے میں بتایا۔ اُن کی بخشش و کرم کے قصے سنائے۔ کسی دربار سے اُن کی وابستگی کے حوالے دیئے۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اُس صوفی صاحب کے پاس جائے گا جس کے اُس کے ایک دوست نے سب سے زیادہ قصے سُنائے تھے۔

صوفی صاحب نے اُس کا مسئلہ سنا تو نہایت محبت سے فرمایا کہ خدا کو عبادات کی ضرورت نہیں۔ وہ اِس بات سے ماورا ہے کہ کوئی اُس کے لیے نماز پڑھتا ہے یا نہیں، روزہ رکھتا ہے یا نہیں، حج کرتا ہے یا نہیں۔ وہ صرف انسانوں کی خدمت سے خوش ہوتا ہے۔

اُسے صوفی صاحب کا خیال اچھا لگا۔ لیکن انسانوں کی خدمت کے بارے میں اُسے کچھ تحفظات رہے۔ انسانوں کی خدمت کی جائے تو کیونکر؟

انسانوں کی خدمت بھی احکامِ شریعت بجالانے سے کم مشکل کام نہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ احکامِ شریعت کی بجا آوری کے نتائج کا فی الفور اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن انسانوں کی خدمت کے اثرات اُن کی خوشی کی صورت میں فوری طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

اُسے صوفی صاحب کا آئیڈیا اچھا لگا لیکن اُن سے فوری طور پر متفق ہونے کی بجائے اُس نے کچھ انتظار کرنا زیادہ مناسب جانا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مولوی صاحب سے اتفاق کرنے کے بعد اپنے خیالات تبدیل

کرنے کی طرح وہ صوفی صاحب سے بھی اتفاق کرنے کے بعد اپنے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائے۔

چنانچہ صوفی صاحب سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ سڑک پر نکل کھڑا ہوا۔ کبھی یہاں گیا کبھی وہاں۔ کبھی اِس شخص سے ملا کبھی اُس سے۔ لیکن اُسے کہیں اپنے سوال کا تسلی بخش جواب نہ ملا۔ خدا کو خوش کرنے کا سوال اُس کے لئے ایک معمے کی طرح الجھتا چلا گیا۔

آخر اپنی تلاش سے تھک ہار کر وہ ایک سڑک پر نصب ایک بنچ پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ آنے جانے والوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ سکول جانے والے لڑکے لڑکیاں۔ دفتروں میں کام کرنے والے کلرک۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور۔ اخبار بیچنے والے ہاکر۔ ریڑھی بان۔ خوانچہ فروش۔ اور سڑکیں صاف کرنے والے خاکروب۔

سب اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ جو کام کر رہے تھے وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔ جو کام پر جا رہے تھے وہ اپنے کام کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کسی کا وہ مسئلہ نہیں تھا جو اس کا مسئلہ تھا۔ کوئی خدا کو خوش کرنے کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

اُسے لگا اُن سب لوگوں کے لئے خدا ایک غیر متعلقہ مسئلہ تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بے اختیار ہنسنا شروع ہو گیا اور پھر ہنستا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تب اُس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر آنکھوں سے آنسو صاف کئے، بنچ سے اٹھا، اور اپنے کام کی طرف چل پڑا۔

اونٹ اور بدّو

ہم اس زمین کے سوتیلے بیٹے
زندگی کی اُلجھی راہوں پہ چلتے
ایسے دشت میں آ گئے ہیں
جہاں شرق و غرب اور شمال و جنوب
اپنا مفہوم کھو چکے ہیں
ہم میں سے کچھ دائیں ہاتھ
اور کچھ بائیں ہاتھ جانا چاہتے ہیں
لیکن جہاں دائیں اور بائیں کی تمیز
ختم ہو جائے
جہاں سچ جھوٹ
اور جھوٹ سچ کا لبادہ اوڑھ لے
وہاں آگ کا الاؤ جلا کر
چند لمحے رکنا
چلتے چلے جانے سے
زیادہ بہتر ہے
ہم اِس زمیں کے سوتیلے بیٹے
زندگی کی اُلجھی راہوں پہ چلتے
ایسے دشت میں آ گئے ہیں۔۔۔۔

"یار یہ بکواس بند کرو۔ مجھے تمہارا گیت زہر لگ رہا ہے۔" اونٹ نے خیمے سے لمبی گردن باہر نکال کر بدُو کو ڈانٹ پلائی۔ اونٹ کب خیمے کے اندر گھسا تھا اور بدُو کب باہر آیا تھا نہ اونٹ کو یاد تھا نہ بدُو کو۔

ابھی اونٹ اور بدُو کا مکالمہ چل رہا تھا کہ بدُو کو دور صحرا میں غبار اُڑتا دکھائی دیا۔

بدُو نے آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے بیٹھے اپنے تھیلے سے دف نکال کر بجانی شروع کر دی۔ اونٹ نے گردن خیمے کے اندر کھینچتے ہوئے پھر بدُو کو سرزنش کی:

"تم آگ تاپو یا دف بجاؤ تمہارے لئے محشر کی گھڑی آ پہنچی ہے۔"

بدُو نے اونٹ کی طرف توجہ دیئے بغیر دف بجانی جاری رکھی۔ اِتنے میں اُڑتے غبار میں سے ایک بڑی سی جیپ نمودار ہوئی۔

جیپ بدُو کے پاس آ کر رُکی۔ اُس میں سے بندوق تانے ایک گورا باہر نکلا۔ بندوق کی نالی بدُو کی طرف تھی۔ بدُو نے بندوق کی پرواہ کئے بغیر دف بجانی جاری رکھی۔ بلکہ ساتھ پھر وہی گیت الاپنا شروع کر دیا۔

"ہم اِس زمین کے سوتیلے بیٹے
زندگی کی اُلجھی راہوں پہ چلتے
ایسے دشت میں آ گئے ہیں۔۔۔۔۔"

اونٹ کو بدُو کے گیت سے پھر اُلجھن ہوئی لیکن اُس نے صورتِ حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے اپنی گردن خیمے کے اندر رکھنے میں عافیت محسوس کی۔

گورے نے بندوق کی نالی بدُو کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا: "میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

بدُو نے دف بجانی اور گانا بند کیا۔ پھر گورے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا: "بندوق سے بندوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ سوال زبان سے پوچھا جاتا ہے۔ ابھی تک تم نے مجھ پر بندوق تان رکھی تھی۔ سوال اب پوچھ رہے ہو۔ بولو میں تمہاری کیسے مدد کر سکتا ہوں۔"

اونٹ خیمے کے اندر گورے اور بدُو کا مکالمہ سن رہا تھا۔ وہ اب تک بدُو کو بے وقوف سمجھتا آ رہا تھا۔ گورے کے ساتھ بدُو کا مکالمہ سُن کر اُسے بے اختیار بدُو پر پیار آیا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار بدُو اچھالگا۔

بدُو کا جواب سُن کر گورے نے بندوق کی نالی کا رخ اُس کی طرف سے ہٹاتے ہوئے کہا: "وہ اور اُس کے ساتھی صحرا میں راستہ بھول گئے ہیں۔ گاڑی کا سارا پٹرول ختم ہو چکا ہے۔ اُن کے سارے انسٹرومینٹ خراب ہو چکے ہیں۔ خوراک ختم ہو چکی ہے۔ وہ بغداد واپس جانا چاہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کیسے واپس جا سکتے ہیں۔"

گورے کی بات سُن کر بُو نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔"اُنہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُن کا مسئلہ تو اُس کا اونٹ بھی حل کر سکتا ہے۔"

اونٹ نے خیمے کے اندر اپنا ذکر سنا تو پریشان ہُوا۔ اُس نے بدُو کے بارے میں اپنی رائے فوراً تبدیل کر لی۔ اسے پھر بدُو دنیا کا احمق ترین انسان دکھائی دینے لگا۔

گورے نے بدُو کے منہ سے اونٹ کا ذکر سُنا تو حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے دور دور تک کہیں اونٹ دکھائی نہ دیا۔ اونٹ خاموشی سے خیمے کے اندر گورے اور بدُو کا مکالمہ سُنتا رہا۔

جیپ میں بیٹھے فوجیوں میں سے ایک نے بندوق بدُو کی طرف سیدھی کرتے ہوئے اُس کے پاس اپنے کھڑے ساتھی سے کہا کہ۔۔"یہ اونٹ کی اولاد ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں کوئی اونٹ نہیں۔ یہ اپنے کسی ساتھی دہشت گرد کا انتظار کر رہا ہے۔ اِس سے پہلے کہ اِس کے دہشت گرد ساتھی یہاں پہنچیں ہمیں اِس کی کھوپڑی اُڑا دینی چاہئے۔"

اونٹ نے بدو کی جان خطرے میں دیکھی تو اُس نے خیمے سے اپنی گردن نکال کر گورے فوجیوں سے کہا کہ وہ خیمے کے اندر آرام کر رہا ہے۔

گوروں کو اونٹ کی بات بالکل پلے نہ پڑی۔ لیکن اُنہیں احساس ہوا کہ بدُو سچ کہہ رہا تھا۔ اُنہوں نے اپنی بندوقوں کی نالیاں نیچی کر لیں۔

بدُو نے پھر اپنا گیت الاپنا شروع کر دیا:

" ہم اِس زمین کے سوتیلے بیٹے
زندگی کی اُلجھی راہوں پہ چلتے
ایسے دشت میں آ گئے ہیں
جہاں شرق و غرب اور شمال و جنوب
اپنا مفہوم کھو چکے ہیں"

پہلے بدُو کے گیت پر صرف اونٹ ناراض ہو رہا تھا۔ اب اُس کے پاس کھڑے گورے سپاہی نے دوبارہ اپنی بندوق کی نالی بدُو کی کھوپڑی کی طرف سیدھی کی اور اُسے حکم دیا کہ وہ اپنا بے ہودہ گیت بند کرے ورنہ وہ اُس کی کھوپڑی اڑا دے گا۔

بدُو نے گانا بند کیا اور گورے سے کہا کہ۔۔۔" وہ سخت بد ذوق آدمی ہے۔ بندوقوں سے کھیلتے ہوئے اُس کی حسِ جمال مر چکی ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ وہ اپنے گیت میں یہی رونا رو رہا ہے کہ وہ صحرا میں راستہ بھول چکا ہے۔ اُس کا اونٹ اُس کی آخری امید ہے لیکن اونٹ نے آگے چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ بلکہ اُس نے اُسے خیمے سے باہر نکال دیا ہے اور خود اُس کے خیمے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اُس نے رات اِس الاؤ کے پاس بیٹھ کر گزاری ہے۔ جبکہ اونٹ خیمے میں آرام کر رہا ہے۔"

گورے نے بدُو کی بات سن کر اپنی بندوق کی نالی پھر نیچے کر لی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ بدُو کے ساتھ کیا سلوک کرے۔

وہ اور اُس کے ساتھی کئی دن سے صحرا میں بھٹک رہے تھے۔ اُن کا کھانے پینے کا سارا سامان ختم ہو چکا تھا۔ سمت نمائی اور صدائی رابطے کے سارے آلات خراب ہو چکے تھے۔ جیپ میں چند گیلن پٹرول باقی تھا۔ ابھی تک اُن کو بچانے والی کوئی ٹیم بھی صحرا میں اُن تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ اکیلا بدُو اور اُس کا اونٹ تھا جو

اُنہیں کئی دنوں تک صحرا میں بھٹکنے کے دوران دکھائی دیا تھا۔ اُسے مار کر وہ اُمید کی آخری کرن بھی گل نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اونٹ خیمے کے اندر بدّو اور گورے کی پریشاں حالی پر خوش ہو رہا تھا۔ وہ دونوں سے بے زار تھا۔ بدّو اور اس کے آباواجداد ہزاروں سالوں سے اُس سے صحرا میں بیگار لے رہے تھے۔ گوروں نے پوری دنیا کا سکون تباہ کر دیا تھا۔ یہ ایسی عجیب انسانی نسل تھی جو نہ اِس طور خوش تھی نہ اُس طور۔ یہ صحراؤں کو سمندر اور سمندروں کو صحرا بنانا چاہتے تھے۔ آبادیوں کو ویران اور ویرانوں کو آباد کرنا چاہتے تھے۔

اونٹ خیمے میں بیٹھا یہ سب سوچ رہا تھا۔ اُدھر جیپ میں بیٹھے گوروں کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ کئی دنوں سے اُن کے منہ میں خوراک کا ایک نوالہ تک نہیں گیا تھا۔

اپنے ساتھی اور بدّو کے باہمی مکالمے سے بے زار انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ فیصلہ کر کے جیپ سے اترے۔

اونٹ نے اُن کے قدموں کی آہٹ سے اندازہ لگایا کہ وہ خیمے کے طرف آ رہے ہیں۔ اُس نے خیمے سے نکل کر بھاگنا چاہا لیکن گوروں میں سے ایک نے دو فائر کئے ایک اونٹ کے دل پر اور دوسرا گردن پر۔

اونٹ بلبلاتا ہوا گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گوروں نے چاقوؤں سے اونٹ کا گوشت کاٹ کر الاؤ پر بھون کر کھانا شروع کر دیا۔

بدّو خاموشی سے اُنہیں اونٹ کا گوشت بھونتے اور کھاتے دیکھتا رہا۔ گوروں نے اُسے بھی اونٹ کا گوشت پیش کیا لیکن اُس نے گوشت کھانے سے انکار کر دیا۔

اُسے اپنے اونٹ کی ہلاکت کا افسوس تھا لیکن وہ مسلح گوروں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے دوبارہ دف کے ساتھ پُر سوز آواز میں گانا شروع کر دیا۔

" ہم اِس زمین کے سوتیلے بیٹے / زندگی کی اُلجھی راہوں پہ چلتے / ایسے دشت میں آ گئے ہیں۔

ہوا نے سب کو بتا دیا ہے

"ایک دن
یہ دن بدلیں گے
ایک دن
ساری تاریکی
چھٹ جائے گی۔
ایک دن
انسانوں کے ذہنوں پہ پڑی
ساری ظلمت
ہٹ جائے گی
ایک دن
سب انسان دیکھیں گے
سچ کا سورج جیسا
چمکتا چہرہ
اُس دن ساری تفریقیں
مٹ جائیں گے
صرف انساں باقی رہ جائے گا
ایک دن۔۔۔"

اُس نے یہ لائنیں کاغذ پر لکھیں اور پھر چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ صبح سے اُس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُسے بھوک بھی نہیں تھی۔ وہ کچھ کھانا پینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اب لکھتے لکھتے تھک گیا تھا تو چائے بنانے لگا تھا۔

صرف ایک قلم کاغذ پر اُس کا زور چلتا تھا۔ باقی ہر چیز اُس کے دائرہ اختیار سے باہر تھی۔ وہ روز بُری خبریں سنتا، پہروں اُن پر کُڑھتا اور پھر قلم کاغذ پکڑ کا بیٹھ جاتا۔ اُس کے کمرے میں ہر طرف کاغذ بکھرے تھے جن پر اُس نے کچھ نہ کچھ لکھ رکھا تھا۔

پہلے اُس کی بیوی زندہ تھی۔ وہ جو کچھ لکھتا وہ اُسے فائل میں لگا دیتی۔ اُس اللہ کی بندی نے مختلف فائل فولڈر بنا رکھے تھے۔ ایک فائل فولڈر نظموں کا تھا، دوسرا مضامین کا، تیسرا کہانیوں کا اور ایک گالیوں کا جو ہر روز وہ کاغذ پر لکھ کر پھینک دیتا تھا۔

اِن فولڈروں میں اُس اللہ کی بندی نے کئی سیکشن بنا رکھے تھے۔ جیسے نظموں کے فولڈر میں ایک سیکشن اِنقلابی نظموں کا تھا۔ دوسرا رُومانی نظموں کا اور تیسرا جمالیاتی نظموں کا۔ اِسی طرح مضامین کے فولڈر میں ایک سیکشن سیاسی مضامین کا تھا، ایک سماجی کا اور ایک معاشی کا۔ کہانیوں والے فولڈر کی تقسیم بھی کچھ ایسے ہی تھی۔ اِس میں ایک سیکشن تجریدی کہانیوں کا تھا، ایک سماجی کہانیوں کا اور ایک مابعد الطبیعاتی کہانیوں کا۔

گالیوں کے فولڈر میں بھی کئی سیکشن تھے۔ خدا کو گالیاں، حکومت کو گالیاں، نظام کو گالیاں، لیڈروں کو گالیاں اور جھوٹے اور منافق دانشوروں کو گالیاں۔

دانشوروں کو گالیوں کے سیکشن کے اُس اللہ کی بندی نے کئی حصے کر رکھے تھے۔ ایک اُن دانشوروں کو گالیوں کا سیکشن تھا جو چٹا سفید جھوٹ بولتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ غلط کہہ رہے ہیں لیکن اُن کا مفاد اِسی میں تھا کہ وہ تواتر کے ساتھ جھوٹ بولتے رہیں۔ دوسرا اُن دانشوروں کے نام گالیوں کا سیکشن تھا جو نہیں جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ صرف پراپیگنڈے کا شکار تھے۔ کچھ خدا کے نام پر

جھوٹ بولتے تھے۔ کچھ سامراج کے نام پر اور کچھ حکومتِ وقت کے نام پر۔ لیکن وہ جو کہتے یہ سوچ کر کہتے کہ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ اُنہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی نہ کسی حادثے کے نتیجے میں کسی پراپیگنڈے کا حصہ بن گئے ہیں۔ جیسے پیدائیشی مسلمان ساری عمر ایک سُنے سُنائے اسلام کا پراپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا اسلام سے دُور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اُس کی بیوی سارا دن اُس کے لکھے کاغذات اکٹھے کرتی۔ اُن پر لکھا پڑھتی اور پھر مناسب فولڈر میں لگا دیتی۔ کبھی اُس کی تحریریں پڑھ کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی، کبھی اُس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی اور کبھی اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتیں۔

اسے اپنی بیوی کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو جاتا کہ جو اُس نے لکھا ہے اُس کا سماج پر کیا اثر ہو گا۔ وہ اپنی تحریروں پر اپنی بیوی کے ردِّعمل کو سماج کا ردِّعمل سمجھتا تھا۔ اُس کا سماج اُس کی بیوی سے شروع ہوتا اور اُسی پر ختم ہو جاتا۔

جو نظم اُس نے ابھی لکھی تھی وہ پہلے بھی ایسی کئی نظمیں لکھ چکا تھا۔ فیض احمد فیض کی طرح اُسے بھی اُمید تھی کہ ایک دن ضرور آئے گا، اور وہ بھی اُس کی زندگی میں، جب تاج اُچھالے جائیں گے، تخت گرائے جائیں گے اور راج کرے گی خلقِ خدا۔

اُس کی بیوی اُس دن کا انتظار کرتے فوت ہو چکی تھی۔ اُس بے چاری کی زندگی میں تو وہ دن نہیں آیا تھا۔ لیکن اُس کی تحریروں کی چکی ابھی تک چل رہی تھی۔ جس سے طرح طرح کی تحریریں بر آمد ہو رہی تھیں۔ لیکن اب اُن تحریروں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لئے وہ سب اُس کے ارد گرد اُس کے کمرے اور کمرے سے باہر پورے گھر میں فرش پر بکھری تھیں۔

وہ پیشے کے اعتبار سے یونیورسٹی میں ادبیات کا پروفیسر تھا۔ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے وہ عوام کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن ملازمین کے بھی سیاسی جذبات ہوتے ہیں۔ وہ بھی سماج کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ بھی حکومتی پالیسیوں سے ویسے ہی متاثر ہوتے ہیں جیسے عام لوگ۔ آٹے، دال

اور چینی کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں تو اُن کا بجٹ بھی متاثر ہوتا ہے۔ جب اُن پر بوجھ بڑھ جائے تو وہ بھی ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔

اِسی طرح اگر ملک میں سیاسی عدمِ استحکام ہو۔ ملک پر نااہل لیڈرشپ قابض ہو۔ اِیسے لوگ حکمران بن جائیں جو گندم اور جو میں فرق نہ کر سکیں لیکن عوام کی ذہانت کی قدم قدم پر توہین کریں۔ ملکی خزانہ لُوٹیں۔ آئین اور قانون کو اپنی رکھیل سمجھیں تو سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں ایسے طوفان اُٹھنے لگتے ہیں جنہیں کسی نہ کسی طرح اخراج کے راستے چاہئے ہوتے ہیں۔

اُس نے اِس ذہنی انتشار کا حل تحریروں کی شکل میں نکالا تھا۔ یونیورسٹی میں اپنی ملازمت کے دوران وہ روزانہ ایسی تحریریں لکھ کر فلور پر پھینک دیتا اور اُس کی بیوی اُنہیں اُٹھا کر مناسب فولڈر میں لگا دیتی۔ اِن تحریروں سے اُس کی فرسٹریشن نکل جاتی۔ اُس کی سرکاری حیثیت بھی متاثر نہ ہوتی۔ اور اُس کی تحریریں بھی محفوظ ہو جاتیں۔

بیوی کی وفات کے بعد۔۔۔ وہ چائے بنانے سے پہلے سو بار سوچتا تھا۔ کھانا بنا کر کھانے کی بجائے بھوکا سو جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ تحریریں سنبھالنا اُسے سب سے مشکل کام دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ فرش پر گرے کاغذوں سے اُس کے گھر کا منظر موسمِ خزاں میں سوکھے پتوں سے اَٹے کسی گارڈن کا سا تھا۔

پتے سُوکھے ہوں تو اُن میں آگ لگنا آسان ہو جاتا ہے۔ آگ لگے تو پھر دھواں بھی اُٹھتا ہے۔ دُھواں اُٹھے تو خلقِ خدا متوجہ ہوتی ہے۔ خلقِ خدا متوجہ ہو تو حرکت پیدا ہوتی ہے اور خلقِ خدا حرکت میں آئے تو اِنقلاب آتے ہیں۔ حکومتیں اُلٹ جاتی ہیں۔

اُس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا تو ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ چائے کے پانی کے اُبلنے کے ساتھ ساتھ ہوا میں تُندی آنے لگی۔ ہوا میں تُندی پیدا ہوئی تو گھر کا دروازہ جس پر چٹخنی نہیں لگی تھی چوپٹ کُھل گیا۔ فرش پر جگہ جگہ پھیلی تحریریں ہوا کے دوش پر سوار سارے شہر میں پھیل گئیں۔

کوئی نظم کسی کے ہاتھ آئی۔ کوئی مضمون کسی کے ہاتھ لگا۔ کوئی کہانی کسی کے دل میں اتر گئی۔ اُس نے ہوا کے دوش پر اُڑتے کاغذات کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی ہانپ کر بیٹھ گیا۔ ہوا کے دوش پر اُڑتی اُس کی کئی برسوں پر محیط تحریریں شہر میں دست بدست گردش کرنے لگیں۔

کسی نے کہا آسمان سے کسی فرشتے نے کاغذ پر لکھ کر ملک کے لوگوں کے نام پیغام پھیلایا ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔ کسی نے کہا کسی دوسرے ملک نے جہاز سے پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کے لئے یہ باغیانہ تحریریں پھینکی ہیں۔

ریٹائرڈ پروفیسر کی برسوں کی فرسٹریشن پر مبنی تحریریں آخر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں۔ اُس کی تحریریں پڑھ کر ان میں ہلچل شروع ہوئی۔ اور پھر یہ ہلچل بڑھتے بڑھتے ایک تحریک میں بدل گئی۔ پروفیسر چائے بنا کر چسکیاں لے کر پیتے ہوئے سوچ رہا تھا لکھے لفظ میں کتنی طاقت ہے۔ اُس نے اب تک یہ تحریریں لوگوں سے چھپا رکھی تھیں۔ لیکن اب ہوا نے یہ سب لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔ اُس نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا سارے شہر کے لوگ اُس کے گھر کے باہر مجمع کی صورت میں اکٹھے ہو کر اس کی نظم با آواز بلند ہم صدا ہو کو گا رہے تھے۔

"ایک دن
یہ دن بدلیں گے
ایک دن
ساری تاریکی
چھٹ جائے گی۔
ایک دن
انسانوں کے ذہنوں پہ پڑی
ساری ظلمت

ہٹ جائے گی
ایک دن
سب انسان دیکھیں گے
سچ کا سورج جیسا
چمکتا چہرہ
اُس دن ساری تفریقیں
مٹ جائیں گے
صرف انساں باقی رہ جائے گا
ایک دن۔۔۔
ایک دن۔۔۔
ایک دن۔۔۔

شیطان

پوری دنیا سے حج کے لئے آئے لوگ شیطان کو کنکریاں مار رہے تھے۔لوگوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ حج کے باقی سارے مراحل میں حاجیوں کا رویہ نہایت نرم تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ شیطان کو مارنے کے لئے کنکریاں اکٹھا کرنا شروع ہوئے اُن میں ایک ان جانا جذبہ عود کر آیا۔ احرام کے باوجود اُن کی نرم خوئی تند خوئی میں بدلنے لگی اور وہ کنکریاں جمع کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتے شیطان کی طرف بڑھنے لگے۔

اصغر بھی حج کے اِس اہم فریضے کے لئے باقی حاجیوں کے ساتھ شیطان کی طرف روانہ ہُوا تا کہ اُسے کنکریاں مارے۔ لیکن دوسرے حاجیوں کے برعکس شیطان کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کے قدموں میں سُست روی آنا شروع ہو گئ۔ یہاں تک کہ وہ سب حاجیوں سے پیچھے رہ گیا۔

اُس نے ایک ایک کر کے مطلوبہ تعداد میں کنکریاں اکٹھی کیں اور آہستہ آہستہ شیطان کی طرف بڑھا۔ جب ہُولے ہُولے قدم اُٹھاتا وہ پہلے شیطان کے پاس پہنچا تو تقریباً باقی سب حاجی اِس اہم فریضے سے فارغ ہو کر کعبے کے طرف روانہ ہو چکے تھے۔

اُس نے پہلے شیطان کو مارنے کے لئے کنکری اٹھائی تو شیطان نے مُسکراتے ہوئے اُسے خوش آمدید کہا اور پھر بولا:

"تم بھی۔۔۔"

شیطان کے استفسار پر اُس کا کنکری مارنے والا ہاتھ ہوا میں مُعلق رہ گیا۔ وہ چاہنے کے باوجود پتھر شیطان کی طرف نہ پھینک سکا۔

"ہاں میں بھی۔۔۔۔"

اُس نے پتھر والا ہاتھ ہوا میں اٹھائے اُسے جواب دیا۔

"میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا تھا۔ تم بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح نکلے۔" شیطان نے مُسکراتے ہوئے جُملہ کسا۔

"ہاں۔ میں اُن سے الگ کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں اُن میں پیدا ہوا تھا۔ اُنہی میں میری پرورش ہوئی۔ اُنہی کے ساتھ مجھے مرنا ہے۔ میں اُن سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" اُس نے تقریباً رونے والے لہجے میں شیطان کو جواب دیا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ تم اُن سے الگ ہو جاؤ۔ کنکریاں تو تم نے پہلے ہی جمع کر لی ہیں۔ اور اُن کی خوب گنتی بھی کی ہے تا کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔مارنے کے لئے تمہارا ہاتھ ابھی تک ہوا میں معُلق ہے۔نہ جانے تم نے اپنا ہاتھ روک کیوں لیا ہے؟"

"بس ایک خیال سے میرا ہاتھ ہوا میں رُک گیا ہے۔" اُس نے شیطان کے طنز بھرے جملے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں خیال۔۔۔خیال ہی اصل قوت ہے۔خیال ہی وہ بیج ہے جس سے عمل کا پودا پھُوٹتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے تناور درخت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خدا اور میں خیال ہی سے انسانوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ گھس جاتا ہے کسی کے خیال میں میں۔ باقی سارا کام انسان خود کرتے ہیں۔"

شیطان کی گفتگو سن کر اصغر کا کنکریاں مارنے والا ہوا میں معُلق ہاتھ نیچے آ گیا۔ کنکری اُس کے ہاتھ سے گر گئی اُس کا جی چاہا وہ مسلسل شیطان سے گفتگو کرتا رہے۔

اُس نے شیطان سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا کہ۔۔۔"لاکھوں لوگوں سے کنکریاں پڑنے کے بعد وہ کیسا محسوس کرتا ہے۔"

اُس کا سوال سُن کر شیطان نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ پھر کہنے لگا: "وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے کنکریاں مارتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر چھپے شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جتنے انسان پیدا کرتا ہے میں اتنے ہی اپنے عکس پیدا کرتا ہوں۔ پھر ہر انسان کے اندر اپنا ایک عکس بٹھا دیتا ہوں۔

اس کے بعد کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی بھر اپنے اندر بیٹھے میرے عکس سے جدوجہد چلتی رہتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے وہ میرے خلاف جدوجہد کر رہا ہے حالانکہ وہ اپنی ذات کے اندر چھپے میرے عکس کے خلاف جدوجہد کر رہا ہوتا ہے۔"

شیطان کی گفتگو سُن کر اصغر کے ہاتھ میں پکڑی دوسری کنکریاں بھی گر گئیں۔ اُس نے شیطان کو کنکریاں مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اُسے لگا شیطان اُس پر غالب آ گیا ہے۔ شیطان کو کنکریاں مارنا حج کا ایک اہم رکن ہے۔ اب وہ کسی طور یہ اہم رکن پورا نہیں کر سکے گا۔

اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اُس نے احرام کی چادر سے اپنے دونوں کندھے ڈھانپتے ہوئے لاحول پڑھی اور نیچے گری ہوئی کنکریاں دوبارہ اُٹھانے کے لئے اپنی کمر جھکائی لیکن وہ خواہش اور کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔

اُس نے پھر لاحول پڑھی، چاروں قُل پڑھے، لیکن وہ پھر بھی کنکریاں نہ اُٹھا سکا۔ شیطان کافی دیر تک اُس کی بے بسی پر محظوظ ہوتا رہا۔ پھر شیطان نے آگے بڑھ کر کنکریاں اٹھائیں اور اُسے تھما دیں۔

"لو دوست۔ میں جانتا ہوں تم کس کشمکش سے دوچار ہو۔ میں تمہارا پُرانا دوست ہوں۔ تمہاری اتنی مدد تو کر سکتا ہوں۔"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر شیطان سے کنکریاں لے لیں۔ اُس کا خیال تھا کہ اب وہ شیطان کو کنکریاں مار کر حج کا یہ اہم رکن پورا کر سکتا ہے۔ لیکن دوبارہ خواہش کے باوجود وہ ہاتھ اٹھا کر شیطان کی طرف کنکری نہ پھینک سکا۔

شیطان نے اُس کی حالت دیکھ کر پھر قہقہہ لگایا:

"دیکھو دوست، جب تم نے کنکریاں خود اکٹھی کی تھیں تم مجھے کنکری نہیں مار سکے تھے۔ اب تو کنکریاں خود میں نے تمہیں تھمائی ہیں۔ اب ان کنکریوں میں اتنی استعداد نہیں رہ گئی کہ وہ مجھ تک پہنچیں۔ اب

تم چاہو بھی تو میری طرف کنکری نہیں پھینک سکتے اور اگر پھینکو گے تو وہ مجھ تک پہنچے گی نہیں۔ اب یہ تمہاری نہیں میری کنکریاں ہیں اور میری کنکریاں مجھے کیسے لگ سکتی ہیں؟"

اصغر نے بے بسی سے شیطان کی طرف دیکھا۔ اُس نے گڑ گڑا کر خدا سے دعا کی کہ وہ شیطان کے خلاف اُس کی مدد کرے۔

لیکن خدا نے اُسی وقت اُسے تنہا چھوڑ دیا تھا جب شیطان کے ساتھ اُس کا مکالمہ شروع ہوا تھا۔ خدا کا رویہ دیکھ کر اُس کی سسکیاں اُس کے گلے اور آنسو اُس کی آنکھوں میں اٹک گئے۔ اُسے لگا وہ صلیب پر لٹکا یسوع مسیح ہے جسے خدا نے تنہا چھوڑ دیا ہے۔

لیکن یسوع مسیح کو تو اپنے اربوں کھربوں پیروکاروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ اُسے کس کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا؟

اُس نے پھر روتے ہوئے خدا سے استدعا کی کہ وہ شیطان کے خلاف اُس کی مدد کرے۔ اُس کو طاقت عطا کرے کہ وہ اُس کی طرف کنکریاں پھینک سکے۔

آخر خدا کو اُس کی حالت پر ترس آیا۔ اُس نے ہمت کر کے ایک کنکری شیطان کی طرف پھینکی۔ جو شیطان سے دور جا گری۔ پھر اُس نے ایک اور کنکری شیطان کی طرف پھینکی لیکن وہ بھی شیطان سے دور جا گری۔ شیطان چند لمحوں تک اُسے جدوجہد کرتے دیکھتا رہا۔ پھر ہولے ہولے چلتا اُس کے قریب پہنچ کر بولا:

"لو میں تمہارے قریب آ گیا ہوں۔ تم چاہو تو مجھے کنکری مار کر اپنے مناسکِ حج پورے کر لو۔ لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تمہاری کنکریاں مجھے لگ بھی گئیں تو تمہارا حج نہیں ہو سکے گا۔"

اصغر نے شیطان کی بات سُنی تو متجسس ہو کر اُس سے پوچھا کہ۔۔۔" وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ اتنی دور سے سفر کر کے حج کرنے پہنچا ہے۔ اُس نے شرعی احکامات کے مطابق سب مناسک ادا کئے ہیں۔ پھر بھلا اُس کا حج کیوں نہیں ہو گا۔"

شیطان نے اصغر کی بات سن کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر اُس نے پرانے مسلمانوں کو یاد کیا۔ اُس نے اصغر کو پرانے مسلمانوں کے بہت سے قصے سنائے۔ پھر کہا:

"پرانے مسلمان اُسے کنکریاں مارتے تھے تو اُسے ایک لذت حاصل ہوتی تھی۔ اُن کی سچائی اور اخلاص پر وہ انہیں دل سے دعائیں دیتا تھا۔ اُن سے کنکریاں کھا کر اُسے لگتا تھا کہ کچھ با کردار انسان اُسے کنکریاں مار رہے ہیں۔ اب مسلمان اُسے کنکریاں مارتے ہیں تو اُسے بہت کوفت ہوتی ہے۔ اُسے لگتا ہے جھوٹوں اور منافقوں کا ایک جمِ غفیر اُسے کنکریاں مار رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ تم بھی اُن میں سے ایک ہو۔ تم بھی جھوٹے اور منافق ہو۔ تمہارا نہ خدا سے کوئی تعلق ہے نہ رسوُل سے۔"

اصغر نے شیطان کی بات سنی تو چڑ کر کہنے لگا: "تم مکار ہو۔ جھوٹے ہو۔ تم مجھے بہکا رہے ہو۔ اپنے بھائی بندوں کے خلاف اُکسا رہے ہو۔ ہم پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں۔ زکواۃ دیتے ہیں۔ نوافل ادا کرتے ہیں۔ ٹی وی پر رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں۔ اگربتیاں جلا کر میلاد کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ خشوع و خضوع سے حضور رسالتمآب پر درود و سلام بھجواتے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر سُریلی آواز میں اُن کے لئے نعتیں پڑھتے ہیں۔۔۔۔" اصغر بولتا جا رہا تھا۔

"بس بس بس۔" شیطان نے اُسے چپ کرایا۔

"دیکھو۔ پھینکو مجھ پر چند کنکریاں اور رفوچکر ہو جاؤ یہاں سے۔ واپس جا کر اپنے نام کے ساتھ تم بھی حاجی کا اضافہ کر لینا۔ اصغر سے حاجی اصغر بن جانا۔ لیکن تم سب مسلمان جہلا کا ایک سیلِ بیکراں ہو۔ بوجھ ہو تم اس دھرتی پر۔ رینگتے ہوئے کیڑے ہو تم۔ تم تو انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہو۔ انسان ہونے کی بنیادی شرط قوتِ عمل ہے۔ مسلسل قوتِ عمل۔ قوتِ عمل سے اپنے آپ کو سنوارنا۔ کائنات کو سنوارنا۔ انسانیت کے آج کو اُس کے گزشتہ کل سے بہتر بنانا۔ لیکن تم اِس زمین کا گند ہو۔۔۔۔ کوڑا کرکٹ ہو۔۔۔۔ خدا نے تمہیں انسان بنایا تھا لیکن تم نے اپنی بے عملی اور جہالت سے انسان ہونے کا حق بھی کھو دیا ہے۔"

شیطان کی باتیں سن کر اصغر کی ہمت جواب دے گئی۔ اُس کے لئے مزید اُس کی باتیں سننا مشکل ہو گیا۔
اُس کے ہاتھ سے کنکریاں گر پڑیں اور وہ حرم کی طرف چل پڑا۔

شیطان نے اُسے اُلٹے پاؤں چلتے دیکھا تو پیچھے سے آواز لگائی:

"حاجی اصغر۔۔۔ مجھے کنکریاں تو مارتے جاؤ۔ مجھے کنکریاں مارے بغیر تمہارے مناسکِ حج پورے نہیں ہوں گے۔ لیکن اصغر شیطان کی بات سُنی اَن سُنی کر کے چلتا رہا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا۔

"مجھے نہیں پورے کرنے مناسکِ حج۔ میں حاجی نہیں بننا چاہتا۔ میں مسلمان بھی نہیں بننا چاہتا۔ پہلے میں ایک انسان بننا چاہتا ہوں۔۔۔۔ صرف ایک انسان۔۔۔ ایک اچھا انسان۔"

کرشنا

پہلی بار میں نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟ ہاں یاد آیا۔۔۔ وہ شمالی ہندوستان میں دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے میں پہاڑیوں پر اچھل کوُد کر رہا تھا۔ کبھی ایک پہاڑی پر کبھی دوسری پہاڑی پر۔ وہ ایک پہاڑی سے دوسری پر اس طرح قدم رکھ رہا تھا جیسے وہ پہاڑیاں نہ ہوں کوئی شاہراہ ہو۔

دیکھنے میں وہ کوئی طویل القامت شخص نہیں تھا۔ مشکل سے ساڑھے چار فٹ کا ہو گا۔ رنگ ایسا جیسے امریکہ میں آباد حبشی غلاموں کے بیٹے بیٹیوں کا۔ حبشی غلاموں کے بیٹیاں بیٹے بھی اُسے دیکھتے تو بے اختیار ان کے منہ سے نکل جاتا: کالا۔

لیکن وہ کس طرح اتنی آسانی سے ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر قدم رکھ رہا تھا۔ یہ بات کم از کم میری عقل سے باہر تھی۔

اُس نے مجھے پریشان دیکھا تو میرے پاس آکر بولا:

"تم ٹھیک تو ہو۔۔۔۔؟"

"ہاں۔ہاں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔" میں نے اپنی حیرانی چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن میں نے زندگی میں اُس کے قد کاٹھ کے کسی آدمی کو اتنی آسانی سے پہاڑیوں پر چلتے نہیں دیکھا تھا۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا کوئی بندر ایک درخت کی شاخ سے جھولتا ہوا دوسری اور پھر تیسری شاخ پر پُھدک رہا ہے۔ صرف یہ نہیں کہ اُس کا قد چھوٹا اور رنگ کالا سیاہ تھا بلکہ وہ دیکھنے میں بھی بہت دبلا پتلا دکھائی دیتا تھا۔ اِس کے باوجود بڑے بڑے قدم اٹھانے کے علاوہ اُس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

لیکن کرشنا بہر حال ایک معمولی انسان نہیں تھا۔ وہ خدا تھا۔ اور خدا معمولی انسان نہیں ہوتے۔ اُن کی غیر معمولی صلاحیتیں ہی اُنہیں عام انسانوں سے ممیز کرتی ہیں۔

اُس نے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو کہنے لگا:

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔۔۔"

"کیا سوچ رہا ہوں۔۔۔۔؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم سوچ رہے ہو کہ میں اتنے بڑے بڑے قدم کیسے اٹھا رہا ہوں کہ میرا ایک قدم ایک پہاڑی پر اور دوسرا دوسری پہاڑی پر پڑتا ہے۔" اُس نے انتہائی نرم لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ میں یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔۔۔۔"اور جانتے ہو کرشنا اِس میں مزید حیران کن بات کیا ہے؟"

"ہاں تم سوچ رہے ہو کہ میں نے تمہارے سوال کرنے سے پہلے تمہارا ذہن کیسے پڑھ لیا۔" مجھے لگا کرشنا سے میری کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ میری حیرانگی کو دیکھتے ہوئے اُس نے خود ہی میرے سوال کی وضاحت کی:

"دیکھو اقلیمِ وقت میں ہر چیز خیال سے بندھی ہے۔ رونما ہونے والے واقعات وقت میں ایک طویل زنجیر کی طرح ہوتے ہیں۔ تم چاہو تو واقعات کی اِس زنجیر کے ساتھ ساتھ چل سکتے ہو۔ ہر واقعے کو رُونما ہونے سے پہلے دیکھ سکتے ہو۔ بلکہ چاہو تو اُس واقعہ کے شاہد بن سکتے ہو۔ اُسے چھو سکتے ہو۔ محسوس کر سکتے ہو۔ اور اگر تم میں جرات ہو تو تم اُس واقعہ کے لمحے میں جی سکتے ہو۔ گویا تم ایک وقت میں کئی وقتوں کی سیاحت کر سکتے ہو۔"

اُس نے اتنا کہا اور پھر رک گیا۔ مجھے لگا وہ میرے خیالات پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر کہنے لگا:

"چلو چھوڑو اِن باتوں کو۔۔۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی سوال تمہیں تنگ کر رہا ہے تو پوچھو، میں تمہارے ذہن میں اُٹھنے والے سوال کا جواب دے کر تمہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"کرشنا میں چاہتا ہوں تم میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دو۔۔۔۔" میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ اُس سے درخواست کی۔

"میں خدا ہوں۔۔اور خدا کا دل نہیں ہوتا۔۔۔" کرشنا نے مسکراتے ہوئے میرے سوال کو طرح دینے کی کوشش کی۔

"اور خدا کبھی چوری بھی نہیں کرتا۔۔۔۔" میں نے کرشنا کو اُس کا بچپن یاد دلانے کی کوشش کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خدا کی بجائے میرے ساتھ انسانوں کی طرح بات کرے۔ میں نے اُس کے سامنے اُس کی بچپن میں مکھن چوری کر کے کھانے کی بات دُہرائی۔ لیکن میری بات کا اُس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ وہ سکون کے ساتھ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔ پھر سپاٹ لہجے میں کہنے لگا:

"زمانِ حقیقی میں نہ بچپن ہے نہ بڑھاپا۔ انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ زمانِ حقیقی میں کبھی کوئی حقیقی تبدیلی رُونما نہیں ہوتی۔"

کرشنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ انسانی سطح پر اُترے۔ بلکہ اُس نے کوشش کی وہ مجھے انسانی سطح سے اُٹھا کر خدائی سطح پر لے جائے۔ اُس کا پہاڑیوں پر چلنا، میرے خیالات کو بغیر گفتگو پڑھنا، گہری جادوئی آواز میں گفتگو کرنا، آدھی ننگی گوپیوں سے التفات، مجھے اُس کی خدائی سطح پر نہ لے جاسکا۔ میری عادت ہے کہ میں خداؤں سے گفتگو کے دوران ہمیشہ انسانی سطح پر مضبوطی سے جما رہتا ہوں۔ یہی میں نے کرشنا کے ساتھ کیا۔ وہ کوشش کے باوجود مجھے اُس ماورائی سطح پر نہ اُٹھا سکا جہاں وہ میرے خیالات کو کنٹرول کرتا۔

خداؤں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ انسانوں سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن انسانوں کی سطح پر اُتر کر زندگی گزارنا پسند نہیں کرتے۔ صرف انسانوں کو وقت کی اقلیم سے گزرنا پڑتا ہے اور اس عمل میں ہر طرح کے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ خدا وقت کی اقلیم سے باہر رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ زمانِ حقیقی میں زندگی گزارتے ہیں۔ اور زمانِ حقیقی میں ماضی یا مستقبل نہیں ہوتا۔ صرف حال ہوتا ہے۔ چنانچہ ماضی نہ ہونے کی وجہ سے خداؤں کو کسی تکلیف دہ یاد کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اسی طرح مستقبل نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی کوئی

خوشگوار اُمید نہیں ہوتی۔ اس لئے خدا نہ یادوں کا عذاب سہتے ہیں نہ اُنہیں اپنی اُمیدیں پوری نہ ہونے کا دُکھ سہنا پڑتا ہے۔ اِس لئے وہ چاہیں بھی تو انسانوں کے ساتھ کبھی حقیقی ہمدردی نہیں کرسکتے۔ صرف انسان ہی انسانوں کے ساتھ ہمدردی کرسکتے ہیں۔ کیونکہ انسان درد آشنا ہونے کی وجہ سے دوسرے انسانوں کا درد سمجھتے ہیں۔ اُنہیں دوسروں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کب کوئی کس کرب سے گزر رہا ہے۔

کرشنا میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ میرے خیالات کا عکس اُس کے چہرے پر آگ کی پرچھائیوں کی طرح دہک رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ اندر ہی اندر ایک درد محسوس کر رہا تھا۔ ایک انجانا درد جس کی ٹیسوں کی وجہ سے وہ دل کی گہرائیوں میں رو رہا تھا۔

چند لمحے پہلے وہ کہہ رہا تھا خدا رویا نہیں کرتے۔ لیکن میں نے دیکھا اب وہ باقاعدہ رونے لگا تھا۔ ایک درد میں مبتلا بچے کی طرح۔ لیکن کیوں؟ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

شاید اُس پر میرا داؤ چل گیا تھا۔ میں خاموشی سے اُس کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ میں اُس کے اندر جاری عمل کو روکنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اُس میں چھپا خدا مر رہا تھا اور اُس مرتے خدا کی جگہ لینے کے لئے ایک انسان جنم لے رہا تھا۔

میں نے چند لمحوں بعد دیکھا وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔

مجھے لگا وہ خداؤں کی دنیا سے نکل کر نیچے انسانوں کی حقیقی دنیا میں چلا آیا تھا۔ ایک ایسی دنیا جس میں انسان پیدا ہوتے، جیتے، طرح طرح کے درد سہتے اور مر جاتے ہیں۔

"کیا ہُوا کرشنا۔۔۔؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

پھر اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے ایک اور سوال اُس کی طرف اچھال دیا:

" کرشنا بولو۔۔۔ بولو۔۔۔ تمہاری اصل کہانی کیا ہے۔۔۔؟"

"میری کہانی کچھ نہیں۔ میں ایک عام آدمی ہوں۔ ایک ایسا عام آدمی جسے کبھی اپنے ماں باپ کی محبت نہ مل سکی۔ چنانچہ اُس محبت کی کمی کو پوری کرنے کے لئے میں نے بہت سی گوپیوں کی محبت کا سہارا لیا۔ میں ایک گوپی سے دوسری گوپی کے پاس گیا۔ میں اُن میں سے ہر ایک میں اپنی ماں ڈھونڈتا رہا۔

جانتے ہو جب آدمی ایک عورت سے دوسری اور دوسری سے تیسری عورت کے پاس جاتا ہے وہ ان میں اپنی ماں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب اُسے اُن میں اپنی ماں نہیں ملتی وہ اُن میں سے نئے بچوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ سلسلہ اُس کی زندگی اور اُن عورتوں سے نئے پیدا ہونے والے بچوں کی زندگیوں میں چلتا رہتا ہے۔ اِسی کو دوبارہ جنم لینا کہا جاتا ہے۔"

"دوبارہ جنم۔۔۔۔۔؟"

میں نے اُس کا جُملہ دُہرایا۔ میں اُس کے فکری بہاؤ کے ساتھ جڑا رہنا چاہتا تھا۔ اُس کے خیالات کے ساتھ ساتھ چلتے اُس کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔

"ہاں دوبارہ جنم۔۔۔۔ دوبارہ جنم کا مطلب ہے ماخذ کی طرف لوٹنا اور پھر اُس میں سے اپنے جیسا نیا انسان پیدا کرنا۔"

"اگر یہ دوبارہ جنم لینا ہے تو پھر پچھلے جنم کی کہانی کیا ہے؟" میں نے نہ چاہتے ہوئے فقط اپنے تجسس کی وجہ سے اُسے ایک اور سوال میں اُلجھا دیا۔

"انسانی تصور ایک عجیب چیز ہے۔ جب انسان وقت کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے وہ اپنے تصور کی قوت استعمال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا تصور اُسے عام انسانوں کی صف سے نکال کر خداؤں کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ اِس کے علاوہ خداؤں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ خدا وہ انسان ہیں جو وقت کی حدود سے نکل چکے ہیں۔ جیسے ہی وہ زمینی وقت کی حدوں سے نکل کر زمانِ حقیقی کی حدوں میں داخل ہوتے ہیں وہ خدا بن جاتے ہیں۔ اس طرح انہیں ایک خاص قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ عام انسانوں کے

خیالات سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتے ہیں۔ وہ اُن کے خیالات کے ذریعے اُن کی قسمتوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اُن کے ذہنوں میں مستقل سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس دکھوں بھری زندگی میں عام انسانوں کو بھی اُن خداؤں کے ساتھ وابستہ ہونا اچھا لگتا ہے۔ وہ اِس وابستگی کے اظہار کے لئے طرح طرح کی رسمیں بنا لیتے ہیں۔ وہ جتنا اُن رسموں کی تکرار کرتے ہیں وہ اپنے خیالات میں اپنے خداؤں کے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

"کرشنا اب تم بولنے لگے ہو۔۔۔اب تم اپنے راز مجھ پر افشا کرنے لگے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ مجھے لگا وہ خداؤں کی دنیا سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔

میں نے لوہا گرم دیکھا تو ایک نئے سوال سے اُس پر ایک اور چوٹ لگائی۔

"کرشنا تم اپنی ماں کا ذکر کرتے ہوئے رو کیوں رہے تھے؟" میرے اس سوال سے کرشنا تقریباً سسکنے لگا۔

"میری ماں۔ غریب اور مجبور ماں۔ ہمیشہ میرے لاشعور میں موجود رہی۔ خدا بننے کے بعد بھی۔ میں کبھی خود کو اُس کے تصور سے آزاد نہ کرا سکا۔ اُس نے اپنی زندگی میں بہت دکھ اُٹھائے تھے۔ میں جب بھی اُس کے دکھوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

عورت اِس دنیا میں مظلوم ترین ہستی ہے۔ وہ معاشی اور سیاسی طور پر کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو جائے۔ وہ مظلوم ہی رہتی ہے۔ اُس کی مجبوریاں اور دُکھ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ بعض اوقات وقتی طاقت سے وہ اپنے اندر مطمئن ہو جاتی ہے لیکن وقت کے ساتھ اُس کی مظلومیت واپس لوٹ آتی ہے۔

میری ماں بھی عام عورتوں کی طرح تھی۔ اُس نے بھی اپنی زندگی میں بہت دکھ اُٹھائے تھے۔ کوئی باعزت انسان ویسی زندگی نہیں گزارنا چاہے گا جیسی میری ماں نے گزاری تھی۔"

اپنی ماں کے دُکھوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے اُسے اس طرح ٹوٹ کر روتے دیکھا تو میں اُسے پہاڑ کے نیچے تنہا چھوڑ کر چل دیا۔

مجھے لگا اب کرشنا خدا نہیں بلکہ ایک عام آدمی تھا۔۔۔ ایک ایسا عام آدمی جس کے دل کا درد آنسو بن کر اُس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

بدھا کے ساتھ چائے کا ایک کپ

یہ اتوار کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ ہائی ٹیک کیفے لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ لوگ مختلف زمانوں، علاقوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے لباسوں سے اُن کے زمانوں، علاقوں اور ثقافتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن اُن سب میں ایک چیز مشترک تھی۔ وہ چیز چائے کے وہ کپ تھے جو اُنہوں نے اپنے ہاتھوں میں اُٹھا رکھے تھے۔ وہ سب گفتگو میں مصروف تھے۔ اُن کے چہروں سے بے پایاں خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں، علاقوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے اتنے عظیم لوگ ایک وقت میں ایک جگہ اکٹھے ہوں۔

چند لمحوں کے لئے میں نے سوچا میں نشے میں ہوں۔ ورنہ میں ایک وقت میں کنفیوشس، مہاتما بدھ، کرشنا، موسیٰ، یسوع مسیح، ہومر، اُمر االقیس، گوئٹے، کارل مارکس اور گاندھی کو ایک کیفے میں بیٹھے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔

وہاں ماضی کی اور بے شمار عظیم شخصیات موجود تھیں لیکن میں اُن سے آشنا نہیں تھا۔ جنہیں میں نے پہچانا تھا اُن کی تصویریں میں نے مختلف میگزینوں دیکھ رکھی تھیں۔

وہاں وہ عظیم شخصیات بھی تھیں جن کا نام لکھنے سے کچھ لوگوں کے منہ کے ذائقے میں ترشی آ سکتی ہے۔ چنانچہ میں عمداً اُن کا نام لکھنے سے گریز کر رہا ہوں۔

میں نے کوشش کی کہ میں کیفے میں بیٹھے ہر عظیم آدمی سے ہاتھ ملاؤں البتہ اُن سے دور رہوں جن سے ہاتھ ملانا کسی طور خطرے سے خالی نہیں۔

سب سے پہلے میں نے کنفیوشس سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ایک میز پر رکھ دیا اور دیر تک میرا ہاتھ تھامے رکھا۔ کنفیوشش کا میرا ہاتھ تھامنا میرے لئے میری زندگی کا سب سے اہم

واقعہ تھا۔ جیسے ہی اُس نے میرا ہاتھ تھاما مجھے لگا چینیوں کی ہزاروں سال کی دانش روشنی کی شکل میں میرے وجود سے گزر رہی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے چینی ریستورانوں میں بانٹی جانے والی فارچون کوکیز میں سے نکلنے والی پرچیوں پر لکھے پیغامات کی پٹی چلنے لگی۔ اُس پٹی پر وہ سب خوش کن باتیں لکھی تھیں جو عموماً کھانے کے بعد مہمانوں کو پیش کی جانے والی کوکیز میں سے برآمد ہوتی ہیں۔ جب تک کنفیوشس نے میرا ہاتھ تھامے رکھا میری آنکھوں کے سامنے چینی تہذیب کے عظیم واقعات کی فلم چلتی رہی۔ ایک کے بعد ایک عظیم چینی دانشور، فنکار، دست کار میرے سامنے اپنے فن کے نمونے پیش کرتے رہے۔ میں حیرت کی تصویر بنا ان کے فن پاروں کو دیکھ کر اُن کے حسن سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کنفیوشس نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں عقیدت بھرے جذبات کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

جیسے ہی میں آگے بڑھا میں نے دیکھا کرشنا اپنی گوپیوں کے ساتھ خوش وقتی میں مصروف تھا۔ لگتا تھا کہ وہ مہابھارت یدھ سے ابھی ابھی لوٹا تھا۔ اُس کے ہاتھ سے اُس کی روائتی مُرلی غائب تھی۔ اُس نے بھی اپنے ایک ہاتھ میں ہائی ٹیک کیفے کا چائے کا کپ پکڑ رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ دھیرے دھیرے ایک گوپی کی ننگی پیٹھ کے ابھار پر پھیر رہا تھا۔ جبکہ دوسری گوپیاں اُسے مالش کر رہی تھیں۔

کرشنا کے قریب ہائی ٹیک کیفے کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس میں دور بیل گاڑیوں کی ایک قطار آہستہ آہستہ چلتی وقت اور فاصلے کی دھند میں غائب ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

اگر میں فانی انسان اس مسحور کن حالت میں ہوتا تو کبھی کسی اور طرف توجہ نہ دیتا۔ لیکن کرشنا نے مجھے دیکھا تو چائے کا کپ ایک گوپی کو پکڑا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور دوسرا ہاتھ مسلسل گوپی کی ننگی پیٹھ کے ابھاروں پر پھیرتا رہا۔

میں کرشنا سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس خوبصورت ماحول میں میں ایسا نہ کر سکا۔ میں کرشنا کی خوش وقتی میں حائل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ گوپیاں مسلسل کرشنا کو مالش کر رہی تھیں۔ مالش کرتے ہوئے

وہ مسحور کُن آواز میں کرشنا کے لئے محبت کے گیت گا رہی تھیں۔ سارے ماحول میں ایک انتہائی خوشگوار خوشبو پھیلی تھی۔

میں نے سوچا کوئی بے وقوف ہی ایسے زیبا ماحول میں دانشورانہ گفتگو کرنا پسند کرے گا۔ میں نے ایسے سوچا ہی تھا کہ کرشنا کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں ایک انرجی روشنی بن کر بہنے لگی۔ اُس روشنی میں سب کچھ غائب ہو گیا۔ نہ ہائی ٹیک کیفے رہا۔ نہ پھولوں کی مہک رہی۔ نہ گوپیاں رہیں۔ نہ اُن کے گیت رہے۔ نہ میں رہا اور نہ کرشنا۔ بس ایک انرجی تھی جو روشنی کی شکل میں وقت کے بے کنار، لامحدود دریا میں ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کی طرح بہتی چلی جا رہی تھی۔

میں نہیں جانتا میں کب تک اس بے صورتی کی حالت میں رہا۔ اگر میں چاہوں بھی تو میں اس صورتِ حال کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس میں اتنا جانتا ہوں جب میں اس بے صورتی کی دنیا سے واپس صورتوں کی دنیا میں آیا کرشنا کے ایک ہاتھ میں ہائی ٹیک کیفے کا چائے کا کپ پکڑا تھا۔ سارے ماحول میں پھولوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ اُس کی گوپیاں اُسے مالش کر رہی تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے اب بھی وہ ایک گوپی کی ننگی پیٹھ کے اُبھار سے کھیل رہا تھا۔

اُس کی گوپیوں میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے مجھے سفید کنول کا ایک پھول تحفے میں دیا جسے تھامے میں کیفے میں آگے بڑھ گیا۔

کیفے کے فرش پر چلتے میں نے دنیا کے تمام عظیم ترین انسان دیکھے۔ وہ جو ماضی میں جنم لے چکے تھے اور وہ جنہیں ابھی مستقبل میں جنم لینا تھا۔ چونکہ ہائی ٹیک کیفے میں وقت ماضی، حال اور مستقبل میں منقسم نہیں تھا۔ صرف حال تھا اس لئے سبھی عظیم انسان وہاں موجود تھے۔ جنہیں ابھی مستقبل میں جنم لینا تھا وہ بھی وہاں اپنے متوقع عظیم کردار کی پریکٹس کر رہے تھے۔

لیکن میں اُن میں سے کسی میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے صرف مہاتما بدھ سے ملاقات میں دلچسپی تھی۔ اتوار کے اس خوبصورت دن میری یہاں آنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میں مہاتما بدھ کے

ساتھ چائے کا ایک کپ پیوں۔ کیونکہ اس ہائی ٹیک کیفے میں سب سے اونچے مقام پر وہی براجمان تھا۔ باقی عظیم لوگوں کے برعکس مہاتمابدھ کے ارد گرد روشنیوں کے کئی ہالے پورے کیفے کو مسلسل منور کر رہے تھے۔

اُس کے ارد گرد روشنیوں کے یہ ہالے دیکھ کر میں سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر مہاتما بدھ میں ایسی کیا بات تھی اُسے یہ مرتبہ اور مقام کیونکر حاصل تھا۔ اُس کی عظمت دنیا بھر کے عظیم لوگوں سے زیادہ حقیقی تھی۔ اِس عظمت کا کوئی آغاز یا انجام نہیں تھا۔ یہ عظمت وقت کی طرح لامحدود اور بے پایاں تھی۔ اُس نے بھی اپنے ہاتھ میں ہائی ٹیک کیفے کا ویسا ہی ایک کپ پکڑ رکھا تھا۔ ماضی حال اور مستقبل کے تمام عظیم انسان کوشاں تھے کہ اُنہیں اُس کے کپ کے مشروب سے پینے کے لئے چند قطرے مل جائیں۔ یہ ایک عجیب صورت حال تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا مہاتمابدھ کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان اور سکون تھا۔ ایک ایسا اطمینان جو صرف اُن انسانوں کے چہرے پر ہوتا ہے جو سب کچھ سننے ، سمجھنے اور جاننے کے بعد خود آخری سچائی کا حصہ بن جاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے سب کچھ فراموش کر دیتے ہیں۔ ایسے میں اُن کی جہالت اُن کے لئے رحمت بن جاتی ہے۔

مہاتمابدھ کی طرف چلتے ہوئے مجھے محسوس ہوا میرا وجود روشنیوں میں نہا گیا ہے۔ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ مجھے لگا میرے دل اور میری روح کی گہرائیوں میں مہاتمابدھ کے چہرے والا سکون پھیلتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ میرا شعور شعورِ خالص میں بدل گیا۔ اب میں ہائی ٹیک کیفے کے فرش پر نہیں چل رہا تھا۔ اب میں مہاتمابدھ کے سامنے کھڑا تھا۔ مہاتمابدھ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ لفظوں کا سہارا لئے بغیر مجھے ہائی ٹیک کیفے میں خوش آمدید کہا اور پھر ایک کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ خواہش کی کھڑکی ہے۔ اس کھڑکی سے باہر چلے جاؤ تمہیں ہمیشہ کی زندگی مل جائے گی۔" اُس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر جمائے کوئی لفظ ادا کئے بغیر مجھ سے کہا۔

"مجھے ہمیشہ کی زندگی نہیں چاہیئے۔" میں نے نہ نفی میں سر ہلایا نہ کوئی لفظ ادا کیا لیکن "انکار" کی ترسیل ہو گئی۔

مہاتمابدھ نے ایک دوسری کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ علم کی کھڑکی ہے۔ اس کھڑکی سے باہر جاؤ۔ سب جان لو گے۔ کچھ چھپا نہیں رہے گا۔" لیکن میں خاموش رہا۔ نہ میں نے نفی میں سر ہلایا نہ کوئی لفظ ادا کیا لیکن پھر "انکار" کی ترسیل ہو گئی۔

میرے دوبارہ انکار پر مہاتمابدھ نے بغیر کسی ردِ عمل کا اظہار کئے ایک تیسری کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ ابدیت کی کھڑکی ہے۔ اس کھڑکی سے باہر جاؤ۔ تمہیں وقت کی اقلیم میں موجود ہر چیز کا ابدی مالک بنا دیا جائے گے۔"

" مجھے کسی چیز کی ملکیت نہیں چاہیئے۔ نہ وقتی نہ ابدی۔" میرے ان کہے انکار پر مہاتمابدھ نے چوتھی کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ دانش کی کھڑکی ہے۔ اس میں سے صرف خداؤں کا گزر ہوتا ہے۔ تم بھی اس میں سے گزرو اور اُنہی میں سے ایک ہو جاؤ۔"

"مجھے خدا بننے سے بالکل دلچسپی نہیں۔ میں اُن سب مشکلات کا سامنا کرنا نہیں چاہتا جن کا سامنا عام طور پر خداؤں کو کرنا پڑتا ہے۔

مجھے صرف تمہارے ہاتھ میں پکڑا کپ چاہیئے۔ میں اُس مشروب سے چند گھونٹ پینا چاہتا ہوں جو تم پی رہے ہو۔" میں نے مہاتمابدھ کے سامنے ہلکا سا خم ہوتے ہوئے التجا کی۔

مہاتمابدھ نے میری استدعا سنی تو مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر محبت سے اپنے ہاتھ میں پکڑا کپ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر مہاتمابدھ کے ہاتھ سے کپ پکڑ لیا اور آہستہ اہستہ قدم اٹھاتا ہائی ٹیک کیفے کے دروازے کی طرف چل پڑا۔

میں جب ہائی ٹیک کیفے سے رخصت ہو رہا تھا میں نے دیکھا کرشنا اب مُرلی بجاتے ہوئے اپنی گوپیوں کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔ کنفیوشس نے دروازے تک آکر مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے الوداع کہا۔ میں کیفے سے باہر آیا تو میں نے دیکھا اتوار کی شام ڈھل چکی تھی۔ سورج مغرب کی گود میں اُتر چکا تھا۔ اور رات کی تاریکی آہستہ آہستہ سارے ماحول میں پھیلتی جا رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اگلے دن سوموار تھا اور مجھے صبح ہی صبح کام پر جانا تھا۔

مولانا

"اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے۔ ہر زندہ چیز محترم ہے۔ چیونٹی سے لیکر انسانوں تک قیامت کے دن حضورِ خداوندی میں سب حاضر ہوں گے اور اُس سے عدل طلب کریں گے۔ حتیٰ کہ وہ چیونٹی جو کسی انسان کے قدموں تلے کچلی جاتی ہے قیامت کے دن اُس انسان کے خلاف خدائے بزرگ و برتر سے انصاف طلب کرے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مخلوق اُس خدائے عادل سے عدل کا مطالبہ کرے اور وہ اُس کے ساتھ عدل نہ کرے۔"

مولانا بول رہے تھے اور اُن کے شاگرد پوری توجہ سے اُن کی بات سُن رہے تھے۔ نہ کسی کے چہرے پر تھکاوٹ تھی اور نہ بوریت۔

مولانا تھوڑا سا دم لینے کے لئے رکے تو ایک شاگرد نے پوچھا:

" مولانا چیونٹی تو اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ انسان اُسے دیکھ بھی نہیں پاتا۔ اگر وہ انسان کے قدموں تلے کچلی جائے تو اِس میں اُس انسان کا کیا قصور ہے۔"

شاگرد کا سوال سُن کر مولانا نے توجہ کی۔ سب طالب علموں نے دیکھا کہ میدانِ حشر سجا ہے۔ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے حضور جمع ہیں۔ چیونٹیاں، مکھیاں، مچھر، بکرے، بھینسیں، اونٹ اور انسان سبھی جمع ہیں۔ واقعتاً ایک چیونٹی اللہ تعالیٰ کے حضور ایک انسان کی شکائت کر رہی ہے کہ اُس نے اُسے اپنے پاؤں تلے کچلا تھا۔ جس سے اُس کی زندگی وقت سے پہلے ختم ہوگئی تھی۔ لہذا اُسے اُس انسان کے خلاف انصاف دلایا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اُس انسان کو اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔

تھوڑی دیر میں فرشتے اُس انسان کو پکڑ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے لے آئے۔ اُس کی زبان بند تھی۔ وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کو حکم دیا کہ وہ اُس کے خلاف اپنے الزمات دہرائے۔ چیونٹی نے من و عن اپنی کہانی کہہ دی۔

اللہ تعالیٰ نے ملزم سے عذر پوچھا۔ اُس نے کہا کہ اُس کے پاس چیونٹی کو کچلنے کا کوئی عذر نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ اُس نے کبھی اُس چیونٹی کو کچلا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اُس کے عذر کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اُسے اُس نے افضل المخلوقات بنایا تھا۔ اُس کو دیکھنے کے لئے آنکھیں عطا کی تھیں۔ سوچنے کے لئے دماغ دیا۔ فیصلہ کرنے کے لئے عقلِ سلیم عطا کی تھی۔ اُس کا فرض تھا کہ احتیاط سے کام لیتا۔

اللہ تعالیٰ نے چیونٹی سے کہا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ کیا کرے تو اُس کے خیال میں انصاف کے تقاضے پورے ہو جائیں گے۔

چیونٹی نے عرض کی:

"اے الٰہیٰ العالمین میں چاہتی ہوں کہ اِسے بھی اُس اذیت سے گزارہ جائے جس سے میں گزری تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ اُس انسان کو من و عن اُسی طرح کچلا جائے جس طرح اُس نے چیونٹی کو کچلا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا حکم سن کر چیونٹی نے استدعا کی کہ الٰہیٰ العالمین اگر فرشتے نے اسے کچلا تو انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے انسان بناؤ اور اسے چیونٹی پھر میں اسے اُسی طرح کچلوں گی جس طرح اِس نے مجھے کچلا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کی بات سن کر اُس سے اتفاق کیا۔ پھر اُس نے چیونٹی کو انسان اور انسان کو چیونٹی بنا دیا۔ چیونٹی نے انسان بن کر چیونٹی بننے والے انسان کو کچلا۔ اُس انسان کو اُس تکلیف سے گزرنا پڑا جو چیونٹی نے کچلے جاتے وقت محسوس کی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کو چیونٹی اور انسان کو انسان بنا دیا۔

جب انصاف کا عمل پورا ہوا چیونٹی اور انسان دونوں مطمئن تھے۔ چیونٹی اپنے چیونٹی ہونے پر خوش تھی اور انسان اپنے انسان ہونے پر۔

طالب علموں نے یہ منظر دیکھا تو مولانا نے پھر اپنی توجہ لیکچر کی طرف مبذول کی۔ وہ کہہ رہے تھے: " اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ قیامت کے دن ہر ایک کے ساتھ عدل کرے گا۔ یہاں تک کہ وہ چیونٹی جو کسی انسان کے قدموں تلے کچلی جاتی ہے اُسے بھی انصاف ملے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی کوئی مخلوق اُس سے انصاف طلب کرے اور وہ اُس کے ساتھ انصاف نہ کرے۔

حشر کے دن لوگوں کے اعتقاد کی حقیقت اُن پر کھول دی جائے گی۔ زیادہ تر لوگوں کا اعتقاد اُن کے گلوں میں طوق کی طرح ہو گا۔ بہت کم لوگ اُس دن طوق سے آزاد ہوں گے۔ "

مولانا کی بات سن کر طالب علموں میں سے پھر ایک نے سوال کیا: " مولانا اعتقاد گردن کا طوق کیسے بنے گا؟"

مولانا نے پھر توجہ کی۔ طالب علموں نے دیکھا حشر کی کاروائی ابھی چل رہی ہے۔ چیونٹی اور انسان عدل الہیٰ پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

پھر اُنہوں نے دیکھا جتنے لوگ بھی میدانِ حشر میں موجود تھے سب کی گردنوں میں ایک ایک طوق پڑا تھا۔ کسی کا طوق بہت بھاری بھر کم تھا۔ کسی کا کم۔ بہت کم لوگوں کی گردن طوق سے آزاد تھی۔

طوقوں والے چاہتے تھے کہ اُن کی گردنیں طوق سے آزاد ہوں لیکن اُن کی گردنیں اُن طوقوں میں اس طرح جکڑی تھیں کہ وہ چاہنے کے باوجود آزادی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سب اللہ تعالیٰ سے ملتجی تھے کہ وہ اُنہیں اُن طوقوں سے نجات دے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُن سے کہہ رہا تھا کہ یہ طوق اُنہوں نے خود اپنی گردنوں میں پہنے تھے۔ وہ حیرانی سے پوچھ رہے تھے کہ اُنہوں نے تو کبھی اپنی گردن میں کوئی طوق نہیں ڈالا تھا۔

اللہ تعالیٰ اُن سے کہہ رہا تھا: "اُن کی گردنوں میں طوق دراصل وہ اعتقاد تھے جن سے وہ زندگی بھر جُڑے رہے۔ ان اعتقادات کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُن سب نے اپنے ذہن میں ایک تصور تراشا تھا اور پھر زندگی بھر اُس تصور کی عبادت کرتے رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ میری عبادت کررہے ہیں حالانکہ میرا اُن کے اعتقاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے ان سب کو بتادیا تھا کہ میں ہر چیز سے منزہ ہوں لیکن یہ اپنی زندگیوں میں تنزیہہ الٰہی کی تہہ تک کبھی نہ پہنچ سکے۔ یہ اپنے خیال کی پوجا کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے خیالات نے انہیں ہلاک کردیا۔ اب ان کی یہ حالت ہے کہ ان کے اعتقاد ان کی گردنوں کا طوق بن گئے ہیں اور وہ اتنے نادان ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اُن کی گردنوں میں یہ بھاری بھرکم طوق کہاں سے آئے ہیں۔"

مولانا بول رہے تھے اور طلبا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

مولانا نے انہیں آنسو بہاتے دیکھا تو کہنے لگے: " تمہیں آنسو بہانے کی بجائے خوش ہونا چاہئے۔ تم وہ چند خوش قسمت طالب علم ہو جنہیں ایسا استاد ملا ہے جو زندگی کے آغاز سے میدان حشر تک اُس عدل کی حقیقت سے آشنا ہے اور تمہیں بھی سمجھا رہا ہے جس پر نظامِ الٰہی قائم ہے۔

اس نظامِ عدل کی وجہ سے حشر کے دن بہت سے جاہلوں کو محض اُن کی جہالت کی وجہ سے معاف کردیا جائے گا لیکن بے شمار عالم جہنم کی آگ میں جلیں گے۔ یہاں تک کہ اُن کا علم بھی اُن کے لئے جہنم کے شعلوں میں تبدیل ہو جائے گا۔"

طالب علموں نے مولانا کی بات سنی تو اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لئے۔ ایک طالب علم نے پوچھا مولانا: " عالموں کا علم جہنم کے شعلوں میں کیسے تبدیل ہو گا؟"

طالب علم کا سوال سن کر مولانا نے توجہ فرمائی۔ حشر کی کاروائی ابھی جاری تھی۔ حضورِ حق سے ہر انصاف پانے والا فرحاں و شاداں اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔

فرشتے بہت سے عالموں کو پکڑ پکڑ کر جہنم میں پھینک رہے تھے۔ عالم چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔ التجائیں کر رہے تھے لیکن فرشتے انہیں پکڑ پکڑ کر جہنم میں پھینکتے جا رہے تھے۔ جیسے ہی فرشتے کسی عالم کو جہنم میں پھینکتے جہنم کے شعلے لپک کر اُس عالم کو اُچک لیتے۔ یہ لپکنے والے شعلے اُن کا علم تھا جس سے وہ لوگوں کو گمراہ کرتے رہے تھے۔

وہ اس علم کے بل بُوتے پر دوسروں سے خدا کے بارے میں جھگڑا کرتے تھے حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ نہ خدا پر اُن کی اجارہ داری ہے اور نہ خدا اُن کی عقل و فکر میں کبھی سما سکتا ہے۔

وہ دین کے نام پر زندگی کے قدموں میں بیڑیاں ڈالتے تھے تا کہ اُس کے ارتقائی سفر کو روکیں حالانکہ خدا چاہتا تھا کہ وہ زندگی کے آئینے میں ہر روز ایک نئی شان سے جلوہ گر ہو۔"

مولانا بول رہے تھے اور طالب علم ہمہ تن گوش اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر حیرت اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت کے رنگ بکھر رہے تھے۔

ایک طالب علم نے پوچھا: " مولانا ہم سچے اور جھوٹے علم میں کیسے امتیاز کریں کہ روز حشر میں ہمارا علم ہمارے لئے جہنم کے شعلوں میں نہ ڈھل جائے؟"

مولانا نے سوال کرنے والے طالب علم کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر سب طالب علموں سے مخاطب ہو کر بولے: "علم کی کسوٹی عمل ہے۔ عمل کی کسوٹی اُس سے مرتب ہونے والے نتائج ہیں۔ جس عمل کے نتائج سے زندگی کے جتنے بڑے حلقے کی تزئین ہو وہ عمل اتنا احسن ہے۔ جس عمل سے زندگی کی تزئین نہ ہوتی ہو اُس سے دور رہو۔

اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے۔ ہر زندہ چیز محترم ہے۔ چیونٹی سے لیکر انسانوں تک قیامت کے دن حضورِ خداوندی میں سب حاضر ہوں گے اور اُس سے عدل طلب کریں گے۔ حتیٰ کہ وہ چیونٹی جو کسی انسان کے قدموں تلے کچلی جاتی ہے قیامت کے دن اُس انسان کے خلاف خدائے بزرگ و

برتر سے انصاف طلب کرے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مخلوق اس خدائے عادل سے عدل کا مطالبہ کرے اور وہ اُس کے ساتھ عدل نہ کرے۔"

مولانا کا لیکچر ختم ہوا تو طالب علم اُن کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اُن کے دل مولانا کی محبت کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کاش سب لوگوں کو اُن کے مولانا سے درس لینے کا موقع مل جائے۔ لیکن اچھے استاد بھی قسمت والوں کو ملا کرتے ہیں۔ ورنہ علم کے نام پر جہالت پھیلانے والوں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔

دلدل

شیخ حسام الدین منہ اندھیرے بندوق اٹھا کر مرغابیوں کے شکار کے لئے روانہ ہُوا تو اپنے ساتھ اپنے پالتو کتے ٹم ٹم کو بھی لیتا گیا۔

وہ سورج نکلنے سے پہلے گاؤں سے دور واقع اُس جھیل تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں برفانی موسموں کی شدت سے بچنے کے لئے شمال کی طرف سے آنے والی مرغابیوں کے قافلے اترا کرتے تھے۔ اُس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس کی عادت تھی کہ وہ سردیوں کے موسم میں مرغابیوں کے شکار کے لئے صبح ہی صبح روانہ ہوتا اور سورج کے نکلنے کے بعد بہت سی شکار کردہ مرغابیاں کندھوں پر لٹکائے گاؤں واپس لوٹتا۔ واپسی پر وہ تقریباً سبھی دوستوں کے گھر رکتا اور ہر ایک کو دو چار مرغابیاں بانٹتا گھر پہنچتا تو اُس کا کندھا مرغابیوں کے بوجھ سے آزاد ہوتا۔

ٹم ٹم گولی لگنے کے بعد گرنے والی مرغابیاں اکٹھی کرنے میں اس کی مدد کرتا۔ اُسے اس کام میں اتنی مہارت ہو چکی تھی کہ اُدھر شیخ حسام الدین کارتوس داغتا اُدھر ٹم ٹم دوڑ کر زمین پر گرتی مرغابیاں پکڑ کر لانی شروع ہو جاتا۔

لیکن ایک دن ایک عجیب اتفاق ہُوا۔ شیخ حسام الدین نے حسب معمول مرغابیوں پر کارتوس داغا تو ایک مرغابی جھیل کے پاس واقع ایک دلدل میں جا گری۔

دلدل کے بارے میں گاؤں میں مختلف کہانیاں مشہور تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس دلدل کے نیچے زمین نہیں تھی۔ اگر کوئی جانور یا انسان اس میں پھنس جاتا تو اُس کا اس دلدل سے زندہ نکلنا مشکل ہوتا۔ آج تک کئی کتے، بکریاں، گائیں، بھینیس اور فرد اس دلدل میں پھنس کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اہلِ گاؤں نے کئی بار مٹی ڈال کر اس دلدل کو بھرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس دلدل کی خونخواری میں

کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اب بھی گاہے بگاہے جو ذی روح غلطی سے اس دلدل میں اترتا اُس کا زندہ نکلنا یقینی طور پر ناممکن ہوتا۔

اس صبح جیسے ہی شیخ حسام الدین نے کارتوس داغا اور مرغابی دلدل میں گری ٹم ٹم حسب عادت مرغابی کو پکڑنے کے لئے دلدل میں اتر گیا۔

شیخ حسام الدین کو ٹم ٹم سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ٹم ٹم کو بچانے کے لئے دلدل میں اتر گئے۔

اب صورتِ حال یوں تھی کہ ٹم ٹم اور شیخ حسام الدین دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے دلدل میں دھنس رہے تھے۔ انسان کا بہترین دوست ہونے کی وجہ سے ٹم ٹم کوشش کر رہا تھا کہ وہ شیخ حسام الدین کی مدد کرے اور شیخ حسام الدین ٹم ٹم سے محبت ہونے کی وجہ سے کوشش کر رہا تھا کہ اُسے دلدل سے نکالے۔ لیکن دونوں کا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کی طرف بڑھنے کے لئے وہ جس قدر دست و پا مارتے تھے دلدل میں دھنستے جاتے تھے۔

دیہاتوں میں لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ علی الصبح کھیتی باڑی اور دیگر کاموں کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں تاکہ دھوپ میں تپش پیدا ہونے سے پہلے اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو جائیں۔

ایسے ہی چند کسانوں پر شیخ حسام الدین کی نظر پڑی تو اُس نے دلدل میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اُنہیں مدد کے لئے پکارا لیکن کسی نے اُس کی پکار نہ سنی۔ وہ تھے بھی اُس سے اتنی دور کہ اُس کی صدا اُن تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

وہ جیسے جیسے دلدل میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مزید دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ ٹم ٹم پہلے ہی تقریباً دلدل میں دھنس چکا تھا۔ اُس کی تھوڑی سی تھوتھنی نظر آ رہی تھی۔ وہ مسلسل دردناک آوازوں میں چوں چوں کر رہا تھا۔ لیکن شیخ حسام الدین اب خود مکمل طور پر بے بس ہو چکا تھا۔ اُسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس نے اُس دن کو کوسنا شروع کیا جب اُس نے شکار کے لئے بندوق خریدی تھی۔ اُن دوستوں کو

کوسا جنہوں نے اُسے شکار کی لت ڈالی تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب اُنہیں کوسنے سے فائدہ؟۔
چنانچہ اُس نے دست وپا مارنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے جامد وساکت رہنے میں عافیت محسوس کی۔
جیسے ہی اُس نے آنکھیں بند کیں اور دست وپا مارنے بند کئے اُس کا دلدل میں دھنسنے کا عمل سست ہو گیا۔
اُس نے بند آنکھوں کے ساتھ خدا سے دعا کی کہ وہ اُس کی مدد کرے اور اُسے دلدل سے نکالے۔ لیکن اُس وقت خدا بھی اُس سے اتنا ہی دور تھا جتنا نیلا آسمان۔
آخر وہ خدا سے بھی مایوس ہو گیا۔ اُس نے دیکھا نیلے آسمان پر چیلیں اڑ رہیں تھیں۔ مرغابیوں کی قطاریں شمالی آسمان سے مسلسل جھیل کے پانی میں اُتر رہی تھیں۔
جو مرغابی اُس کے کارتوس سے گری تھی کب کی مر چکی تھی۔ اُس کا زندگی سے محروم وجود دلدل کی سطح پر پڑا تھا۔ ٹم ٹم کی چوں چوں بھی بند ہو چکی تھی اور اب اُس کی تھوتھنی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ اُس کا اپنا وجود بھی رفتہ رفتہ دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔
انسان کتنا بھی عقلمند کیوں نہ ہو کبھی نہ کبھی اُس پر حماقت غالب آ جاتی ہے اور وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جس سے وہ دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ جتنے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اتنا دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اُسے وہ سب مرغابیاں یاد آئیں جنہیں شکار کے بعد کندھے پر لٹکائے اپنے دوستوں کے گھر جاتا اور بڑے فخر کے ساتھ ان کی بیگمات کو بتاتا کہ آج اُس نے کتنی مرغابیاں شکار کی ہیں۔
خواجہ صاحب کی بیگم ہمیشہ مرغابیاں قبول کرنے سے انکار کر دیتی۔ وہ مسکراتے ہوئے کہتی " شیخ صاحب یہ مرغابیاں ہزاروں میلوں کا سفر کر کے سکون کے چند دن گزارنے اور اپنی اگلی نسل کو جنم دینے کے لئے ہمارے علاقے میں آتی ہیں لیکن ہم اُنہیں موت سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔"
شیخ حسام الدین خواجہ صاحب کی بیگم کی بات ٹالنے کے لئے کہتا "بھابی کبھی مرغابی کی بریانی پکا کر دیکھیں کیا مزے دار ہوتی ہے۔"

"نہیں نہیں ہمیں نہیں پکانی مرغابی کے گوشت کی بریانی۔" خواجہ صاحب کی بیگم ٹالنے کے لئے کہتی۔ ایک آدھ بار شیخ حسام الدین کی بیگم نے باقاعدہ مرغابی کے گوشت کی بریانی پکا کر بھجوائی۔ خواجہ صاحب کی بیگم نے ان کا دل رکھنے کے لئے بریانی رکھ لی لیکن اُن کے جاتے ہی یہ کہہ کر پھینک دی کہ "اللہ نہ کرے کسی دن ان مرغابیوں کے شکار کا حساب شیخ صاحب کو اپنی زندگی سے دینا پڑے۔"

چند دن بعد شیخ حسام الدین کی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی اُنہوں نے پوچھا۔۔" کیسی تھی مرغابی کے گوشت کی بریانی؟"

خواجہ صاحب نے اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد صاف کہہ دیا کہ اُن کی بیگم نے وہ بریانی پھینک دی تھی اور ساتھ ہی اپنی بیگم کا جملہ بھی دہرادیا۔

خواجہ صاحب کی بیگم کی بات سن کر شیخ حسام الدین کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں اُبھر آئیں لیکن پھر یہ بات اُس کے ذہن سے نکل گئی۔

دلدل میں پھنسے پھنسے شیخ حسام الدین کو خواجہ صاحب کی بیگم کی بات یاد آئی۔ اُس نے آنکھیں مُوندھے مُوندھے سوچا شاید یہی وہ وقت ہے۔ شاید اب اُن سب مرغابیوں کی زندگی کی قیمت چکانے کا وقت آن پہنچا ہے جو اُس کی بندوق سے چلے کارتوسوں کا شکار ہوئی تھیں۔

شیخ حسام الدین بند آنکھوں کے ساتھ یہ سب سوچ رہا تھا۔ اُس کا جسم رفتہ رفتہ دلدل میں دھنستا جارہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اب موت یقینی ہے۔ وہ موت کے خوف سے ہوش وہواس کھو بیٹھا اور اُس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔

ایک کسان اپنے بیلوں کی جوڑی کے ساتھ کھیت گاہنے کے بعد اپنے ڈیرے پر واپس جارہا تھا۔ اُس نے شیخ حسام الدین کو دلدل میں پھنسے دیکھا تو جلدی سے بیلوں کی رسی کا پھندا بنا کر اس پر پھینکا۔ رسی کا پھندا شیخ حسام الدین کے بازووں سے پھسل کر چھاتی کے گرد کس گیا۔ کسان نے پنجالی میں رسی باندھ کر بیلوں کے زور سے کھینچا تو شیخ حسام الدین دلدل سے باہر نکل آیا۔

کسان نے شیخ حسام الدین کو دلدل سے نکال کر پانی سے اُس کا جسم صاف کیا۔ اُس کے ہاتھوں اور پیروں پر مالش کی تو اُس کے ہوش ٹھکانے آئے۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کسان کا شکریہ ادا کیا۔

وہ اٹھ کر جانے لگا تو کسان نے پاس پڑی اس کی بندوق اٹھا کر اسے پکڑائی۔ اُس نے چند لمحے بندوق دیکھی اور پھر دلدل میں پھینک دی۔

اُس نے کئی بار اپنے کئی سالوں کے ساتھی اور دوست ٹم ٹم کو آواز دی لیکن اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے کی وجہ سے رونے لگا۔ مردہ مرغابی جسے پکڑنے کے لئے ٹم ٹم نے دلدل میں چھلانگ لگائی تھی اب تک دلدل پر پڑی تھی۔ لیکن ٹم ٹم کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

شہزادی

کہانیاں بہت ہیں اور وقت کم۔ کس کی کہانی پہلے سُنوں اور احاطہِ تحریر میں لاؤں اور کس کی بعد میں۔ وہ پہاڑی لڑکی جس نے مری کی پہاڑیوں میں مال روڈ پر چلتے ہوئے مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی یا گھانا سے اغوا کی گئی اس نوجوان لڑکی کی جسے پہلے ساؤتھ افریقا میں بیچا گیااور بعد میں امریکہ لا کر غلام کی طرح خادمہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔

یا اس نومولود ایرانی بچے کی جس کو اس کی ماں سمیت اس لئے سنگزنی سے ہلاک کر دیا گیا کہ اس نے اس مہذب انسانوں کی دنیا میں محبت کے ایک وقتی اُبال کے سہارے داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ کئی کہانیاں آنسوؤں سے پر ہیں اور کئی قہقہوں سے۔

دنیا بھر کے دکھی انسانوں کو دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ صرف قہقہوں کی گونج پر تیرتی کہانیوں کو احاطہ تحریر میں لاؤں لیکن پھر پاکستان میں ایک عیسائی عورت میرا دامن پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس پر الزام ہے کہ وہ توہینِ رسالت کے جُرم کی مرتکب ہوئی ہے۔ چنانچہ اس الزام میں اُسے پھانسی دی جارہی ہے۔ میں ابھی اُس کی مکمل بات سُن نہیں پاتا کہ ایک مفلوق الحال شاعر اپنی آزاد نظم سنانے کی درخواست کرتا ہے۔

"یار میں شاعری کے ذوق سے بالکل محروم ہوں۔ کیا تم اپنی نظم کسی اور آدمی کو نہیں سُنا سکتے۔" وہ میرا جواب سُن کر آزردہ ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔

"میرے ساتھ زندگی نے ناانصافی کی ہے اور تم بھی مجھ سے بے اعتنائی برت رہے ہو۔ میری نظم نہیں سننا چاہتے تو نہ سنو لیکن بات تو ٹھیک طرح سے کرو۔"

ابھی میں اپنے شاعر دوست کو جواب نہیں دے پاتا کہ ایک سیاہ فام بھکارن میرے پاس پہنچ جاتی ہے۔ وہ مجھ سے فالتو سکوں کے بارے میں پوچھتی ہے۔

میں اُس سے اُس کا نام پوچھتا ہوں۔ وہ اپنے لباس سے ٹپکتی غربت کے باوجود مجھے کہتی ہے کہ اُس کا نام "شہزادی" ہے۔

اُس کا نام سُن کر میں ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا ہوں۔ اپنی جیب سے نکال کر تمام سکے یہ کہتے ہوئے اُس کے حوالے کر دیتا ہوں کہ اگر وہ شہزادی ہے تو اُسے زندگی میں کسی نہ کسی شہزادے کو ڈھونڈنا چاہئے۔ لیکن وہ میری بات سنے بغیر سکے لے کر چل پڑتی ہے۔

شاعر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اُسے بھکارن کا میری بات سنے بغیر چلے جانے سے خوشی ہوئی ہے۔

آخر وہ اپنی آنکھوں میں چھپی بات اپنی زبان پر لے آتا ہے۔

"دیکھا تم نے میری نظم سننے سے جس بے دردی سے انکار کیا تھا اُسے سیاہ فام بھکارن نے کس طرح تم سے چند سکے لے کر تمہاری بات سنے بغیر فوراً کس طرح برابر کر دیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ اُس نے تمہاری بات نہیں سُنی۔"

میں شاعر کے طنزیہ جملے کا جواب دیئے بغیر آگے چل پڑتا ہوں۔ مری کی پہاڑیوں پر چلتی مدد مانگنے والی پہاڑی لڑکی کا دُور دُور تک پتہ نہیں ہے۔ گھانا سے اغوا ہونے والی لڑکی بھی کہیں ہجوم میں گم ہو چکی ہے۔

میں نیویارک میں پارک ایونیو پر آوارگی کر رہا ہوں۔

برفباری کی وجہ سے میں نے سر پر ٹوپی، آنکھوں پر ڈارک شیشوں کی عینک، ہاتھوں پر اُونی دستانے اور اپنے نحیف و نزار جسم پر سیاہ رنگ کا اُوور کوٹ پہن رکھا ہے۔

گھر سے نکلتے وقت میں نے سردی سے بچنے کا پورا انتظام کیا تھا لیکن اِس کے باوجود ٹھنڈ میری ہڈیوں میں سرایت کر رہی ہے۔

میں ایک میکڈانلڈ میں داخل ہو جاتا ہوں۔ میرے ذہن میں ہے کہ میکڈانلڈ سے چائے کا ایک کپ خریدوں گا اور گھنٹہ بھر یہیں بیٹھ کر ٹی وی دیکھوں گا۔ بر فباری میں کمی واقع ہو گی تو زیرِ زمین ٹرین پکڑ کر گھر واپس جاؤں گا۔

میکڈانلڈ میں داخل ہونے کے بعد مجھے یاد آتا ہے کہ میں اپنا بٹوا گھر بھول آیا ہوں۔ میری جیب میں جو چند سکے تھے وہ میں نے سیاہ فام "شہزادی" کو دے دیئے تھے۔

میں تھوڑا سا پریشان ہو تا ہوں اور پھر میکڈانلڈ کے باتھ روم میں پیشاب کرنے کے لئے داخل ہو جاتا ہوں۔ پیشاب کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو پہلے مجھے اپنے دستانے اتارنے پڑتے ہیں۔ دستانوں سمیت انگلیوں سے اُوور کوٹ کے بٹن کھولنا خاصہ مشکل کام ہے۔ دستانے اتار کر اُوور کوٹ کے بٹن کھولتا ہوں۔ پھر پینٹ کی زپ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن انگلیاں اس حد تک سرد ہو چکی ہیں کہ مجھے پینٹ کی زپ پکڑنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔

پیشاب کا دباؤ بڑھ جاتا ہے لیکن مجھ سے زِپ کھل نہیں پاتی۔ آخر بہت مشکل کے ساتھ زِپ کھولتا ہوں۔ پیشاب کرتا ہوں تو مجھے کچھ راحت محسوس ہوتی ہے۔ میں زِپ بند کرکے اُوور کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوں۔ پھر اپنے ہاتھوں پر اُونی دستانے پہنتا ہوں۔ باتھ روم سے نکلتا ہوں تو مجھے "شہزادی" دکھائی دیتی ہے۔ وہ خواتین کے باتھ روم سے باہر نکل رہی ہے۔

میں اُسے دیکھ کر ہاتھ ہلا کر اُسے پکارتا ہوں: "ہائے شہزادی۔" وہ میرے مخاطب کرنے پر مجھے گھور کر دیکھتی ہے

میں پھر ہاتھ ہلا کر اُسے پکارتا ہوں: "ہائے شہزادی۔" وہ مجھے جواب دیئے بغیر آگے بڑھ کر کاؤنٹر کے سامنے لگی لائن میں کھڑی ہو جاتی ہے۔

میں بھی اُس کے پیچھے جا کر لائن میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اُسے اپنے پیچھے میرا لائن میں کھڑا ہونا اچھا نہیں لگتا۔ میں پھر اُسے "شہزادی" کہہ کر پکارتا ہوں لیکن وہ کہتی ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے اور اُس کا نام "شہزادی" نہیں ہے۔

میں اُسے یاد دلاتا ہوں کہ اُس نے ابھی سڑک پر مجھ سے ایک بھکارن کی طرح چند سکے مانگے تھے۔ میں نے اپنی جیب سے سارے سکے نکال کر اُسے دے دیئے تھے۔ میرے استفسار پر اُس نے مجھے اپنا نام "شہزادی" بتایا تھا۔

وہ خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ "تم مجھے تنہا چھوڑو گے یا میں بلاؤں پولیس کو۔" میں پولیس کا نام سُن کر اُسے لائن میں چھوڑ کر میکڈانلڈ سے باہر نکل آتا ہوں۔

باہر ابھی تک برفباری کا سلسلہ جاری ہے۔ کئی فٹ برف گر چکی ہے لیکن تاحال برفباری رُکنے کا نام نہیں لے رہی۔

لیکن برفباری کے باوجود نیویارک متحرک ہے۔ گاڑیاں چل رہی ہیں۔ لوگ سڑکوں پر آجا رہے ہیں۔ میں جدھر دیکھتا ہوں کہانیاں میرے اِرد گرد بکھری ہیں۔ کئی کہانیاں میں نے جیبوں میں اُڑس لی ہیں کہ مناسب وقت پر اُنہیں لکھوں گا۔

کہانیاں بہت ہیں اور وقت بہت کم۔ لیکن میں ابھی تک مری میں مال روڈ پر ملنے والی اُس پہاڑی لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ وہ مجھے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن میں اُس کی بات سُنی ان سُنی کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ پھر گھانا سے اغوا ہو کر ساؤتھ افریقا اور وہاں سے امریکہ اسمگل ہونے والی لڑکی۔ شاید میں اُسے غلامی کی مشقت سے نجات دلا سکوں۔ اور وہ بے چاری عیسائی عورت جس پر توہینِ رسالت کا الزام لگا کر اُسے موت کی سزا سنادی گئی ہے۔ یا وہ نومولود ایرانی بچہ جسے اُس کی ماں سمیت سنگسار کر دیا گیا تھا۔ اُس کی ماں بہت چیخی چلائی تھی۔ ہر پتھر پر اُس کی دلدوز صدائیں فضا میں بلند ہوتی تھیں۔ لیکن اُس نومولود نے تو ایک چیخ بھی بلند نہیں کی تھی۔

آنسوؤں سے بھری کہانیاں۔ قہقہوں سے شرابور کہانیاں۔ کونسی پہلے لکھوں۔ اور کسے کسی اور وقت کے لئے موخر کر دوں۔

وہ شاعر ابھی تک بر فباری میں پھر رہاہے۔ میں اُسے آواز دیتاہوں۔ فی الحال اُس کی نظم سنناسب سے آسان کام ہے۔

میں اُسے آوز دیتاہوں لیکن وہ سُنی ان سُنی کر کے چلا گیاہے۔ "شہزادی" چائے کا کپ پکڑے میکڈانلڈ سے ابھی ابھی باہر آئی ہے۔ وہ کسی اور راہگیر سے فالتو سکے مانگ رہی ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو گر کر میرے گالوں پر جمتے جارہے ہیں۔ میں شاعر کی بے رخی دیکھ کر خود ہی کچھ لائنیں گھڑ لیتاہوں۔

"اے زندگی میں تجھ سے شرمسار ہوں

انسان اتنے بے ضمیر اور بے حس بھی ہوسکتے ہیں۔

کیایہ سب تیرے بیٹے بیٹیاں ہیں؟"

"شہزادی" راہگیر سے چند سکے لے کر میرے قریب سے گزرتی ہے۔ وہ میری نظم سُن کر رُک جاتی ہے۔ مجھے پوچھتی ہے:

"تم رو کیوں رہے ہو؟"

"تم نے مجھے دُکھی کر دیاہے۔" میں اُسے جواب دیتاہوں۔

"دیکھو اجنبی۔ یہ زندگی ہے۔ اِسے جینا سیکھو۔ اِس طرح دُکھی ہو گے تو کیسے چلے گا۔ میں ایک بھکارن ہوں۔ سڑک پر سوتی ہوں۔ لوگوں سے پیسے مانگ کر گزارہ کرتی ہوں۔ کل کی فکر نہیں کرتی۔ نہ گزرے کل کی نہ آنے والے کل کی۔

میں گھانا میں پیدا ہوئی تھی۔ اغواکاروں نے مجھے اغوا کر کے کئی ملکوں میں کئی ہاتھوں میں بیچا۔ مجھ سے مشقت لی۔ میرے ساتھ زیادتیاں کیں۔ مجھے اپنا پیدائشی نام بھی یاد نہیں۔ کوئی پوچھتا ہے تو کہہ دیتی ہوں میرانام شہزادی ہے۔"

میں اُس کی کہانی سُن کر آگے چل پڑتا ہوں۔

وہ مجھے پوُچھتی ہے کہ میں کہاں جارہاہوں۔ میں اُسے بتاتا ہوں کہ میں گھر جارہاہوں۔ وہ پوُچھتی ہے کہ میں کہیں قریب ہی رہتاہوں۔ میں کہتاہوں نہیں میں وہاں سے بہت دور رہتاہوں۔ وہ کہتی ہے ٹرین کیوں نہیں پکڑتے۔ میں کہتاہوں کرائے کے پیسے نہیں۔

وہ اپنی جیب سے چند سکے نکال کر میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہتی ہے:

"لو اتنے پیسوں سے نیویارک میں تم زیرِزمین ٹرین پر کہیں بھی جاسکتے ہو۔" میں نہیں نہیں کرتا ہوں لیکن شہزادی پیسے میری ہتھیلی پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

برفباری ابھی تک جاری ہے۔ کہانیاں میرے اِردگرد بکھری ہیں۔ میں سب کچھ بھول کر زیرِزمین ٹرین اسٹیشن کے لئے بنی سیڑھیاں اُتر رہاہوں۔

ٹرین میں بیٹھ کر مری میں مال روڈ پر ملنے والی لڑکی کے بارے میں سوچوں گا۔ گھانا سے اغوا ہونے والی شہزادی سے ملاقات تو ہوگئی ہے۔ شاید مری والی پہاڑی لڑکی سے بھی کہیں ملاقات ہو جائے۔

باقی رہی ایران میں سنگسار ہونے والی لڑکی اور اس کا نومولود بیٹا اور پاکستان میں توہینِ رسالت کے جرم میں سزائے موت پانے والی عیسائی عورت۔

ان کی کہانیاں میری جیب میں اُڑسی ہیں۔ کبھی نہ کبھی وقت ملا تو وہ بھی لکھوں گا۔ وقت کم ہے اور کہانیاں بہت زیادہ۔

منڈی

جکارتہ سے ڈیڑھ سو میل دور چھوٹے سے گاؤں میں نوجوان جنسی غلام لڑکوں اور لڑکیوں کی منڈی لگی تھی اور دنیا بھر کے شوقین مزاج اُن کی خریداری کے لئے جمع تھے۔

یہ کسی پتھر کے زمانے کی کہانی نہیں تھی۔ اُس زمانے کی کہانی تھی جب انسان آواز سے تیز رفتار جہازوں پر چند گھنٹوں میں دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ سکتے تھے۔

جم بریڈ فورڈ میں ایک فیکٹری اُوونر تھا۔ اُس کی فیکٹری میں دسیوں مزدور کام کرتے تھے۔ یہ مزدور دنیا بھر سے آنے والے اُن مہاجرین کی اولاد تھے جو اُس زمانے میں انگلستان آئے تھے جب سلطنت برطانیہ میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

جب جم کو اُس کے چند انڈونیشی مزدوروں نے بتایا کہ جکارتہ سے ڈیڑھ سو میل دور ایک گاؤں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی منڈی لگتی ہے تو اُسے یقین نہ آیا۔

ایک ویک اینڈ پر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ انڈونیشیا جائے گا اور بذاتِ خود دیکھے گا کہ آیا واقعی ایسی کوئی منڈی لگتی ہے جس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بکتے ہیں۔

وہ جب جکارتہ پہنچا اور وہاں سے ایک ٹیکسی لیکر اُس گاؤں پہنچا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں واقعی لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک منڈی موجود تھی۔ جہاں یورپ اور امریکہ سے آنے والے کئی خریداروں کا جمگھٹا لگا تھا۔

یہ تسلی کر لینے کے بعد کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی منڈی حقیقی طور پر موجود ہے جم نے اس خوبصورت گاؤں کے طور طریقے سمجھنے کے لئے چند یورپی خریداروں سے بات کی۔

نیوزی لینڈ سے آنے والے ایک تاجر نے جس کا نام مارٹن تھا اُسے بتایا کہ اُس نے مستقل طور پر گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر ایک گھر خرید رکھا ہے۔

وہ سال میں کئی ماہ یہاں گزارتا ہے۔ بعض اوقات اُس کے اور دوست بھی اُس کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ یہاں آکر وہ اچھے لگنے والے چند لڑکے اور لڑکیاں خرید لیتا ہے۔ جب تک اس کا جی چاہتا ہے اُن کے ساتھ موج میلا کرتا ہے۔ جانے سے پہلے اُنہیں پھر بیچ جاتا ہے۔

"کیا اس کاروبار کو انڈونیشیا میں سرکاری تحفظ حاصل ہے؟"

"نہیں بھی اور ہاں بھی۔۔۔۔" مارٹن نے جم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

جم نے مارٹن کے جواب پر تعجب سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کاروبار کو سرکاری تحفظ حاصل ہو اور نہ بھی ہو۔"

"سرکاری تحفظ اس لئے حاصل نہیں ہے کہ اس کاروبار کو سرکاری تحفظ دینے کے لئے کوئی قوانین موجود نہیں۔ سرکاری تحفظ اس لئے حاصل ہے کہ کوئی ایسے قوانین نہیں ہیں جو اس کاروبار کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوں۔"

جم ساری بات فوراً سمجھ گیا۔ لیکن مزید جانکاری حاصل کرنے کے لئے کہنے لگا کہ "لڑکوں اور لڑکیوں کی منڈی تو اُس نے دیکھ لی ہے لیکن یہ سارا کاروبار کیسے چلتا ہے۔"

"یہ سب کام ایجنٹوں کے ذریعے ہوتا ہے۔" جیسے ہی آپ منڈی میں داخل ہوتے ہیں ایک ایجنٹ آپ کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ آپ لڑکے اور لڑکیاں پسند کرنے کے بعد قریب ہی واقع اُس کے دفتر میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں قیمت اور وقت طے ہوتا ہے۔ آپ چند ہفتوں سے لیکر چند مہینوں کی مدت کے لئے جتنے لڑکے یا لڑکیاں چاہتے ہیں خرید لیتے ہیں۔ سارے پیسے پیشگی ادا کرنا ہوتے ہیں۔ ان ایجنٹوں کے کارندے اُن لڑکوں اور لڑکیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ کوئی لڑکا یا لڑکی آپ کی مدتِ خرید سے رُوگردانی کرنے کی جُرات نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی ایسا کرنے کی جرات کرے تو اُسے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔"

مارٹن سے تفصیل جاننے کے بعد جم نے بھی وہاں ایک گھر خریدا اور ایک ایجنٹ کے ذریعے وقتی طور پر ایک لڑکی خرید لی۔

لڑکی کی عمر مشکل سے سترہ اٹھارہ سال تھی۔ وہ ایک خوش شکل انڈونیشی لڑکی تھی۔ جسے کسی دور دراز گاؤں سے خریدا گیا تھا۔

لڑکی کا نام آمنہ تھا۔ جم لڑکی کو لیکر اپنے نئے گھر میں لے آیا۔ اس نے آمنہ کو چند ہزار پونڈ میں ایک سال کے لئے خریدا تھا۔

اُسے اندازہ تھا کہ گھر خریدنے کی وجہ سے اب اُس کا انڈونیشیا آنا جانا لگا رہے گا۔ آمنہ کی وجہ سے اُس نے انڈونیشیا میں اپنے قیام کی مدت بڑھادی۔ اُس نے انگلستان میں اپنے فیکٹری کے مینجر کو فون پر بتادیا کہ وہ چند ہفتے اندونیشیا میں رہے گا۔ اُس نے کاروبار کے سلسلے میں اُسے ضروری ہدایات دیں اور یہ بھی بتادیا کہ وہ جب چاہے کاروباری معاملات میں راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اُس سے وہاں پر رابطہ کر سکتا ہے۔

چند ہفتے کے قیام کے بعد جم تقریباً اُس گاؤں کے سب امور کو سمجھنے لگا۔ اُسے قریب ہی واقع سب تفریحی مقامات کا علم حاصل ہو گیا۔

وہ آمنہ کو ساتھ لیکر اکثر اُن مقامات پر چلا جاتا۔ ایسے مقامات پر آنے جانے سے اُس کی کئی اور یورپی خواتین وحضرات سے جان پہچان ہو گئی۔ یورپی مرد اگر جنسی سرگرمیوں کے لئے لڑکے اور لڑکیاں خریدتے تھے تو کئی یورپی خواتین بھی جنسی تلذذ حاصل کرنے کے لئے لڑکے اور لڑکیاں خریدتی تھیں۔ یہ سب یورپی نژاد اکثر اپنی پارٹیاں کرتے جن میں خوب دھاچوکڑی مچتی۔ پارٹیاں کبھی کسی کے گھر میں اور کبھی کسی ہوٹل میں منعقد ہوتیں۔ ان پارٹیوں میں اکثر زرخرید لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل ہوتے۔ بعض اوقات ایسی پارٹیوں میں بھی اُن لڑکوں اور لڑکیوں کے سودے ہوتے۔

اِن یورپیوں کے یہاں آنے کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے ملکوں کے قوانین لڑکے اور لڑکیاں بیچنے اور خریدنے جیسی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن تیسری دنیا کے کئی ممالک کی حکومتیں فقط

زرِ مبادلہ کمانے کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کے خرید و فروخت کے اِس کاروبار سے چشم پوشی کرتے تھے۔

دوسرے یورپین باشندوں سے ملاقاتوں میں جم کو پتہ چلا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی ایسی منڈیاں صرف انڈونیشیا ہی میں نہیں بلکہ تھائی لینڈ، نیپال، سری لنکا اور دنیا کے کئی دیگر ممالک میں بھی موجود ہیں۔

آمنہ صرف جسمانی طور پر ہی خوبصورت نہیں تھی وہ ذہنی طور پر بہت ذہین اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔ اُس نے ذہنی طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس کے باپ نے اُسے جن حالات میں بیچنے کا فیصلہ کیا تھا وہ اُن حالات کو تبدیل کر کے رہے گی۔

منڈی میں بکنے کی وجہ سے وہ جم کی جنسی غلام تھی لیکن عورت ہونے کے ناطے کسی سطح پر اُسے بطور عورت اپنی طاقت کا اندازہ تھا۔

اُس نے بہت جلد اپنی محبوبانہ اداؤں اور معصومانہ حرکتوں سے جم کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ بہت جلد وہ جم کی جنسی ضرورت سے بڑھکر اُس کی نفسیاتی ضرورت بن گئی۔ ایک بار یہ عمل شروع ہوا تو پھر آمنہ پر جم کا نفسیاتی انحصار بڑھتا چلا گیا۔

جم نے اُسے ایک سال کے لئے خریدا تھا۔ معاہدے کے مطابق جم پر لازم تھا کہ وہ سال کے اختتام تک یا اُس سے پہلے اُسے دوبارہ منڈی میں ایجنٹ کے پاس واپس لائے۔

اس ایک سال کے دورانیے میں چند بار جم انگلستان واپس گیا اور اپنی فیکٹری کے معاملات نپٹا کر واپس چلا آیا۔ وہ جب بھی انگلستان گیا آمنہ کی یاد اُسے پہلے سے بڑھ کر آئی۔ وہ اُسے ہمیشہ یہ کہہ کر جاتا کہ وہ چند ہفتوں میں واپس لوٹے گا لیکن وہ دو چار دنوں میں واپس لوٹ آتا۔

آمنہ نے جم سے ملاقات کے فوراً بعد اُس سے انگریزی سیکھنا شروع کر دی۔ اُس کا انگریزی سیکھنا جم کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اُسے انڈونیشی زبان نہیں آتی تھی۔ وہ جم کے ساتھ مختلف پارٹیوں میں جاتی تو اُس کے حسن اور جوانی سے بھرپور بدن کو دیکھ کر کئی مردوں کے پٹھے اکڑ جاتے۔ وہ اُسے جم سے

خریدنے کی بات کرتے لیکن جم بھری محفل میں اُسے اپنے بازووں میں لے کر ایسی خواہش کا اظہار کرنے والوں پر واضح کر دیتا کہ اُسے بیچنے کا اُس کا کوئی ارادہ نہیں۔

لیکن ایک سال کی مدت بڑی تیزی کے ساتھ بیت گئی۔ معاہدے کے مطابق آمنہ کو منڈی میں واپس ایجنٹ کے پاس لے جانے کا دن قریب سے قریب تر آنے لگا۔ اُس نے ایجنٹ سے مل کر دوبارہ آمنہ کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن ایجنٹ نے اُسے بتایا کہ اُس کو خریدنے کی خواہش کئی اور خریداروں نے کی ہے۔ وہ منتظر ہیں کہ ایک برس کی مدت پوری ہو تو وہ اُسے خریدیں۔

یہ سُن کر جم کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کافی امیر آدمی تھا لیکن جو دوسرے لوگ آمنہ کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے تھے وہ بھی کم امیر نہیں تھے۔ وہاں یورپ اور امریکہ کے ایک سے بڑھ کر ایک امیر لوگ اس کاروبار میں مصروف تھے۔

اِدھر یہ صورت حال تھی تو اُدھر انگلستان میں اُس کی عدم موجودگی کی وجہ سے اُس کے کاروبار کی حالت دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ اُس کا مینجر ایک کرپٹ آدمی تھا۔ جم کی عدم موجودگی سے اُس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ جم کو اُس کی ضرورت کی رقم فراہم کرتا رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس کی دولت کا صفایا بھی کرتا رہا۔

آمنہ کے منڈی میں واپس جانے سے پہلے جم کے مینجر نے اُسے فون پر بتایا کہ عدالت کی طرف سے اُس کی فیکٹری کی نیلامی کا حکمنامہ جاری ہوا ہے۔

جم نے یہ خبرِ بد سُنی تو اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے انگلستان میں اپنے وکیل سے پتہ کیا کہ اتنی بڑی فیکٹری ایک سال میں نیلامی میں کیسے جا رہی ہے؟ وکیل نے اُسے بتایا کہ اُس کے مینجر نے نہ صرف اُس کے اثاثے اللوں تللوں میں اڑا دیئے ہیں بلکہ اُس نے فیکٹری کے سپلائرز کو گزشتہ ایک سال سے بل ادا نہیں کئے۔ اپنی رقوم وصول کرنے کے لئے انہوں نے عدالت سے رجوع کیا ہے۔ اُن کی درخواست پر عدالت نے فیکٹری کی نیلامی کا حکمنامہ جاری کر دیا ہے۔

اتفاق سے جم کو جس دن آمنہ کو منڈی واپس لے جانا تھا اُسی دن عدالت نے اُس کی فیکٹری کی نیلامی کی تاریخ مقرر کی تھی۔

آخر وہ دن آ پہنچا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے جم آمنہ کے ساتھ منڈی پہنچا۔ ایجنٹ نے آمنہ کے لئے دی گئی مختلف آفرز کے بارے میں اُسے بتایا۔ آمنہ کے حسن کے شیدائیوں نے ایک سے ایک بڑھ کر بولی لگائی تھی۔

جم اپنی مالی تباہی کی وجہ سے اُس میں سے کسی بھی آفر سے بہتر آفر پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ آمنہ کو ایجنٹ کے حوالے کر کے ٹوٹے دل کے ساتھ گھر پہنچا تو اُس کے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

انگلستان سے اُس کے وکیل کا فون تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اُس کی فیکٹری نیلامی میں اُس کے کسی مخالف تاجر نے خرید لی ہے۔ نیلامی میں اتنے پیسے وصول نہیں ہوئے جن سے سب سپلائرز کے بل ادا ہو جاتے چنانچہ عدالت نے انگلستان میں اُس کے تمام اثاثوں کی قرقی کا حکم دے دیا ہے۔

اُس نے ٹوٹے دل کے ساتھ جام میں شراب انڈیلی اور شام کی تنہائی میں آمنہ کو یاد کر کے رونے لگا۔ جکارتہ سے ڈیڑھ سو میل دور انسانوں کی منڈی میں اُس کا سب کچھ نیلام ہو چکا تھا۔

چند دوزخیوں سے ملاقات

روزِ حشر میں حساب کتاب کا مرحلہ جاری تھا۔ ابھی لسٹ میں میرا نام بہت نیچے تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ فارغ وقت سے فائدہ اٹھایا جائے اور چند دوزخیوں سے ملاقات کی جائے تا کہ قبل از وقت اندازہ ہو جائے کہ مجھے کن لوگوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وقت گزارنا ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے فرشتوں سے دوزخ کی سیاحت کی درخواست کی تو وہ میری استدعا پر قدرے حیران اور ناراض ہوئے۔ ناراض اس لئے کہ ابھی حساب کتاب کا مرحلہ باقی تھا اور میں پہلے سے دوزخ کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ حیران اس لئے کہ لوگوں کی دوزخ کے خوف سے گھگیاں بندھی تھیں اور میں اس طرح دوزخ میں گھومنے پھرنے کی استدعا کر رہا تھا جیسے وہ دوزخ نہ ہو بلکہ میکسیکو میں سفید ریت کا کوئی بیچ ہو۔

میری خواہش پر انہوں نے میری درخواست ملک الملائک تک پہنچائی ۔ ملک الملائک نے میری درخواست پر غور کرنے کی بجائے فرشتوں کو میرے دماغ کے مُعائنے کا حکم دیا۔

فرشتوں نے ٹھونک بجا کر میرے دماغ کا مُعائنہ کیا اور اُس کی مکمل صحت کی تصدیق کی۔ اُن کی رپورٹ سن کر ملک الملائک نے کمالِ مہربانی سے کام لیتے ہوئے اُنہیں حکم دیا کہ وہ میری خواہش کی تکمیل کریں۔ ملک الملائک نے ساتھ ہی ہدایت کی کہ چونکہ ابھی مجھے باقاعدہ دوزخ میں جانے کا پروانہ نہیں ملا اس لئے بہتر ہو گا کہ مجھے آگ سے بچنے والا لباس پہنایا جائے۔

میں نے بہتیرا کہا کہ میرے اندر بھی آگ کا ایک الاؤ جل رہا ہے اِس لئے دوزخ کی آگ کا مجھ پر اثر نہیں ہو گا لیکن اُنہوں نے چانس نہ لینے کا عذر پیش کرتے ہوئے اصرار کیا کہ اگر مجھے دوزخ کی سیاحت کرنی ہے تو مجھے آگ سے بچاؤ کا لباس پہننا پڑے گا ورنہ میری خواہش پوری نہیں کی جائے گی۔

فرشتوں کا موڈ دیکھتے ہوئے میں نے بادلِ نخواستہ آگ سے بچاؤ کا لباس زیبِ تن کیا اور دوزخ کے چند داروغوں کی معیت میں عازمِ جہنم ہُوا۔

جہنم کے داروغوں کا دوزخ میں یہ حال تھا جیسے کسی ٹھنڈی سڑک پر چہل قدمی کر رہے ہوں۔ اگرچہ شعلے بھڑک بھڑک کر آسمان کو چھو رہے تھے لیکن داروغے آپس میں اٹھکیلیاں کرتے دوزخ میں آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔

دوزخ میں پہنچنے کے بعد مجھے ملک الملائک کی دور اندیشی کا اندازہ ہوا۔ اگر میں نے اُس کی بات نہ سُنی ہوتی تو اپنے اندر کی شاعرانہ آگ کے باوجود میں ایسی آگ کے شعلوں میں فوراً بھسم ہو جاتا۔ مجھے داروغوں کے ساتھ دوزخ کے شعلوں میں چلتے ہوئے خوب اندازہ ہو رہا تھا کہ آگ کی لپٹیں کتنی شدید ہیں۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میں نے دروغوں سے پوچھا کہ دوزخ میں لوگوں کی گروہ بندی کیسے کی جاتی ہے۔

میرے استفسار پر دوزخ کے داروغوں نے بتایا کہ دوزخ میں لوگوں کی گروہ بندی اُن کے گناہوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

میں نے پوچھا کہ کیا جنت میں بھی یہی نظام ہے۔ میرے سوال پر انہوں نے بتایا کہ وہ جنت کی اندرونی صورتِ حال کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جنت میں ان کا داخلہ بند ہے۔ مسلسل دوزخ میں رہنے کی وجہ سے اُن کے وجودوں میں اتنی حرارت اکٹھی ہو چکی ہے کہ اگر وہ جنت میں چند لمحوں کے لئے داخل ہوں تو اس سے بھی اہلِ جنت کے لئے ناآسودگی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ زیادہ سے زیادہ دوزخ سے باہر آ جا سکتے ہیں۔ لیکن جنت کی طرف اُن کے جانے پر مکمل پابندی ہے۔

داروغوں کی معیت میں چلتا میں آگے پہنچا تو میں نے دیکھا ایک جگہ دنیا بھر کے مذہبی راہنما آگ کے شعلوں میں جل رہے تھے۔ اُن میں پیرانِ کلیسا و کنشت کے علاوہ بڑی تعداد ہمارے علمائے دین کی بھی تھی۔

میں نے دوزخ کے داروغوں سے اتنے زیادہ مذہبی راہنماؤں کی جہنم میں موجودگی کے بارے میں سوال کیا تو اُنہوں نے کہا میں خود اُن سے دریافت کروں کہ اُنہیں دوزخ میں کیوں پھینک دیا گیا ہے۔

داروغہ جی کی حوصلہ افزائی سے میں نے جہنم کے شعلوں میں جلتے ایک مولانا سے پوچھا کہ اُنہیں عالم دین ہونے کے باوجود دوزخ میں کیوں پھینک دیا گیا ہے۔

مولانا نے آگ کے شعلوں میں جلتے ہوئے جواب دیا: "دنیا میں مذہب ہر انسان کی نفسیاتی ضرورت تھا۔

ہم نے انسانوں کی اِس نفسیاتی ضرورت سے فائدہ اٹھایا۔ اُنہیں اپنے ذاتی مفاد کے لئے دین کے نام پر گمراہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو حق پیدا کیا تھا۔ لیکن ہم نے انسانوں کے دلوں میں دنیاوی زندگی کے بارے میں وسوسے ڈالے۔ اُنہیں مذہب کے نام پر بے عملی کی تعلیم دی۔ اللہ کا کہنا تھا کہ ہر انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ ہم نے لوگوں سے کہا کہ اُنہیں محنت کی بجائے دعاؤں پر انحصار کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ بے عملی کی وجہ سے اُن کی زندگیاں جہنم بنتی چلی گئیں۔

بے عملی کی وجہ سے اُن کی زندگیاں جس قدر جہنم بنتی گئیں اُن کا ہم پر انحصار بڑھتا گیا جس سے ہمارا کاروبار اور چمکتا رہا۔ ہم اُن کی غربت اور محرومیوں کو قسمت کا لکھا کہہ کر اُنہیں جدوجہد سے روکتے۔ انسانوں کو بے عملی کی تعلیم دینے کی وجہ سے آج ہم دوزخ کی آگ میں جل رہے ہیں۔"

میں نے دوزخ کی آگ میں جلتے ملاؤں کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا، اُن کے علم سے خدا کی پناہ مانگی، اور داروغوں کی معیت میں آگے بڑھ گیا۔

چلتے چلتے میں تھوڑا آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ ایک جگہ دنیا بھر کے سیاست دان دوزخ کے شعلوں میں جل رہے تھے۔

پاکستان کے تقریباً سبھی سیاست دان وہاں موجود تھے۔ اُن میں فوجیوں اور غیر فوجیوں کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ وہ مسلسل آگ کے شعلوں میں جل رہے تھے۔ کرب سے چیخ اور چلا رہے تھے۔ کوئی اُن کی داد رسی کے لئے موجود نہیں تھا۔

جہنم کی جن چڑیلوں کو اُن کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا اُن کی شکلیں اتنی خوفناک تھیں کہ اُنہیں دیکھتے ہی میری انتڑیاں تقریباً باہر آ گئیں۔ وہ اس طرح اُن سیاست دانوں پر آگ ڈال رہی تھیں جیسے مائیں بچوں کو نہلاتے ہوئے اُن پر پانی ڈالتی ہیں۔ وہ جیسے ہی اُن پر آگ ڈالتیں کرب اور تکلیف کی وجہ سے اُن کی چیخ وپکار اور خوفناک ہو جاتی۔

ان میں سے بہت سے سیاست دانوں کو میں جانتا تھا۔ دنیا میں میری خواہش ہوتی تھی کہ میں اُن کے ساتھ ہاتھ ملاؤں، تصویریں کھنچواؤں، لیکن خوش قسمتی سے مجھے اُن میں سے کسی کے ساتھ نہ ہاتھ ملانے کا موقع ملا نہ تصویر کھنچوانے کا۔

اُنہیں دوزخ میں دیکھ کر مجھے اس بات پر ہلکی سی تسکین ہوئی کہ دنیا میں نہ میں نے کبھی اُن کے ساتھ ہاتھ ملایا نہ کسی کے ساتھ تصویر بنوائی۔

میں نے اپنے ہمراہی داروغہ سے اُن سیاست دانوں کو دوزخ میں پھینکے جانے کی وجہ پوچھی۔ اُس نے ایک بار پھر میری حوصلہ افزائی کی کہ میں خود اُن سے پوچھوں کہ اُنہیں کیوں دوزخ میں پھینک دیا گیا ہے۔

میں نے باقی ملکوں کے سیاست دانوں کی بجائے چند پاکستانی سیاست دانوں سے اُن کے دوزخ میں پھینکے جانے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔۔"سیاست نے انہیں موقع عطا کیا تھا کہ وہ مناسب اقدام سے لوگوں کی زندگیاں بہتر بناتے لیکن اُنہوں نے سیاست جیسے مقدس پیشے کو لوگوں کی زندگیاں بہتر بنانے کی بجائے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کیا۔ کئی ایسے اقدام کئے جن سے اُن کی زندگیاں بہتر ہونے کی بجائے بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اُنہیں جان بوجھ کر غریب رکھا تاکہ وہ ہمارے دستِ نگر رہیں۔ دوسرے ممالک کے حکمرانوں کے ساتھ مل کر اپنے لوگوں کو غلامی کی ایسی زنجیریں پہنائیں جن سے وہ جیتے جی کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ حالانکہ ہمارا فرض تھا کہ ہم اُن کی آزادیوں کو یقینی بناتے۔ اُنہیں اندرونی اور بیرونی استحصال سے بچاتے اور اُن کی خوشحالی کے لئے عملی اقدام کرتے۔"

سیاست دانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر داروغہ جی کی معیت میں میں دوزخ میں آگے بڑھا تو میں نے جگہ جگہ کئی ملکوں کی فوجوں کے جنرل، نوکر شاہی کے نمائندے، اور سرکاری عمال دیکھے جنہیں پہلے ہی سزا سُنائی جاچکی تھی اور وہ دوزخ کی آگ میں جل رہے تھے۔

اُن میں سے بھی کئی ایک سے میں نے اُن کے دوزخ میں پھینکے جانے کی وجوہات جاننے کے لئے سوالات کئے۔

دوزخ میں گرے اِن لوگوں سے بات چیت کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کا ارتقا، ارتفاع اور مسلسل زیبائش خدا کے لئے کتنے ضروری امور تھے۔

جتنے لوگوں سے دوزخ میں میری ملاقات ہوئی اُن سب نے زندگی کے مسلسل ارتقا اور ارتفاع میں کسی نہ کسی طرح علمی یا عملی طور پر رکاوٹیں ڈالی تھیں جسے ناقابلِ معافی جرم قرار دے کر اُنہیں ہمیشہ کے لئے دوزخ میں پھینک دیا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں دوزخ میں مزید آگے بڑھوں داروغہ جی نے مجھے ایک فرشتے کی معیت میں یہ کہہ کر میدانِ حشر میں واپس بھجوا دیا کہ حساب کتاب کی لئے میرا نمبر اب سرِ فہرست پہنچ چکا ہے اور مزید دوزخیوں سے ملاقات کی بجائے اب مجھے اپنے حساب کتاب کے عمل سے گزرنا ہے۔

مکالمے کا قتل

احمد صاحب پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ وکالت میں اُن کی تیسری نسل تھی۔ اُن سے پہلے اُن کے والد اور دادا بھی وکیل تھے۔ وکالت کے پیشے سے وابستگی کی وجہ سے علاقے میں اُن کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ اُن کا معمول تھا وہ سرِ شام کھانا کھا کر سیر کی غرض سے گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ بعض اوقات اُن کے ملنے والے کبھی اُنہیں کسی پان کی دوکان اور کبھی چائے کے کسی کھوکھے پر روک لیتے۔ اور ان سے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتے جو دیر تک چلتا رہتا۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ سیر کے لئے اپنے گھر سے نکلے چند ملنے والوں نے اُنہیں سرِ راہ گھیر لیا۔ یہ ملنے والے مقامی کالج کے چند طالب علم تھے جو احمد صاحب سے موجودہ ملکی صورتِ حال پر بحث مباحثہ کرنا چاہتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد اُنہوں نے یکے بعد دیگرے احمد صاحب پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ ملک کی موجودہ صورتِ حال پر پریشان تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ کیا ہونے جارہا ہے۔

ملک کے بارے میں لڑکوں کی تشویش دیکھ کر احمد صاحب نے حسبِ معمول جیب سے سگریٹوں کا پیکٹ نکالا، ایک سگریٹ سلگایا اور فضا میں دھواں چھوڑتے ہوئے کہنے لگے:

"پاکستان پٹڑی سے اتر گیا ہے۔ آغاز تو ٹھیک تھا لیکن بعد میں اتنی بار اس کی ڈائریکشن تبدیل ہوئی ہے کہ اب یہ چاہے بھی تو راہِ راست پر نہیں آسکتا۔۔۔۔" پھر تھوڑے توقف سے بولے۔۔۔۔" اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی چاہتا بھی نہیں کہ پاکستان راہِ راست پر آئے۔"

لڑکوں نے احمد صاحب کی بات سُنی تو پریشان ہو گئے۔ وہ سب ملک کے مستقبل کے بارے میں پہلے ہی پریشان تھے احمد صاحب کے جواب نے اُنہیں اور بھی پریشان کر دیا۔

اُن کی حالت اُس مریض جیسی تھی جو جانتا ہے کہ وہ بیمار ہے لیکن کوئی دوائی کھانا نہیں چاہتا۔ خاص طور پر کوئی کڑوی دوائی تو بالکل نہیں کھانا چاہتا۔

اُن کی حالت دیکھتے ہوئے احمد صاحب نے کہا: "علاج تو ہے لیکن دوائی ذرا کڑوی ہے۔"

" احمد صاحب، آپ کڑوی سے کڑوی دوائی تجویز کریں ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم پاکستان کو بحرانوں سے نکالنے کے لئے وہ دوا استعمال کریں گے۔ پاکستان کے عوام سے بھی درخواست کریں گے۔ اُن کے سامنے ہاتھ جوڑیں گے کہ اپنے وطن کی خاطر وہ آپ کی تجویز کردہ کڑوی گولی نگلیں۔"

احمد صاحب نے ان کی بات سُنی تواُن کے چہرے پر گہری سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔ اُنہوں نے سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچا اور پھر بولے:

"صرف انسان بن کر سوچنا اور عمل کرنا شروع کر دیں۔ باقی سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

احمد صاحب کی بات سن کر لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔ وہ اپنی ناتجربہ کاری سے احمد صاحب کی بات کی گہرائی نہ سمجھ سکے۔ لیکن پھر بھی استفہامیہ انداز میں بولے:

"احمد صاحب یہ کونسی کڑوی گولی آپ نے تجویز کی ہے۔ ہم سب انسان ہیں اور انسان بن کر سوچتے ہیں۔ لیکن ہمارے مسائل گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے جارہے ہیں۔"

"سب پاکستانی انسان ضرور ہیں۔ لیکن وہ انسان بن کر سوچتے نہیں ہیں۔ وہ مُردوں کو زندوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ مُردوں کی عزت کے نام پر زندوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ موت کے بعد کی زندگی کے نام پر اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی موجودہ زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔

کوئی مسلمان بن کر سوچتا ہے، کوئی عیسائی بن کر، کوئی پارسی بن کر۔ اور جو زیادہ گہرائی میں جانا چاہتا ہے وہ شیعہ، سُنی، وہابی، بریلوی اور قادیانی بن کر سوچنے لگتا ہے۔ اور جس کی اس سے تسلی نہیں ہوتی وہ اس دائرے کو اور پھیلانے کے لئے پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان یا مہاجر بن جاتا ہے۔"

احمد صاحب کی بات سُن کر وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ اُنہیں بات سمجھ آ گئی تھی۔ انسان بن کر سوچنا، انسانوں کی طرح عمل کرنا، عقیدے، نظریئے اور خیالات کے اختلاف کے باوجود دوسروں کو اپنے جیسا انسان سمجھنا اور ان کی عزت کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔

جب احمد صاحب نے دیکھا کہ وہ اُن کی بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں تو اُنہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔
"کیا انسان ہونے کے ناطے سب کو رہنے کے لئے ایک اچھا گھر چاہئے؟" اُنہوں نے لڑکوں سے وکیل کی طرح ایک سوال پوچھا۔
لڑکوں نے اُن کے سوال پر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بیک زبان بولے: "ہاں، احمد صاحب، اِس بات میں کیا شک ہے کہ سب کو رہنے کے لئے ایک اچھا گھر چاہئے۔"
ان کا جواب سن کر احمد صاحب نے کہا: " اگر یہ طے ہے تو ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس بات کا اہتمام کیوں نہیں کرتے کہ سب سے پہلے ہر پاکستانی کو رہنے کے لئے ایک اچھا گھر فراہم کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ اُس کا نظریہ یا عقیدہ کیا ہے۔
احمد صاحب کی بات سُن کر لڑکے ہنسنے لگے اور پھر ہنستے چلے گئے۔ احمد صاحب اُن کو ہنستے دیکھ کر خود بھی مسکرانے لگے۔
"احمد صاحب ہم جانتے ہیں کہ آپ ہمیں آہستہ آہستہ کس طرف لے جارہے ہیں۔"
"کہاں لے جارہا ہوں؟" احمد صاحب نے سگریٹ کا ایک اور طویل کش لگایا اور دُھواں فضا میں چھوڑ دیا۔ دُھواں احمد صاحب اور لڑکوں کے درمیان منحنی خط بن کر فضا میں پھیلتا چلا گیا۔
"آپ ہمیں کسی نہ کسی طرح مذہب سے دُور لے جانا چاہتے ہیں۔" اُنہوں نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ احمد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
احمد صاحب نے جب دیکھا کہ لڑکے کسی طور مذہب سے ہٹ کر سوچنے کے لئے تیار نہیں تو اُنہوں نے ایک اور تہہ در تہہ سوال غبارے کی طرح فضا میں چھوڑا۔
"اچھا یہ بتاؤ اگر پاکستانی اچھے گھر میں رہیں، تین وقت پیٹ بھر کر کھانا کھائیں، سب بچے اچھے اسکولوں میں پڑھیں، بیماروں کا اچھے ہسپتالوں میں علاج ہو، سفر کرنے کے لئے اچھا ٹرانسپورٹ سسٹم ہو، اچھی سڑکیں ہوں، جدید ریلوے سسٹم ہو جس پر تیز رفتار گاڑیاں چلیں، لوگوں کو ملازمتیں ملیں، کام کرنے

کا ماحول صاف ستھرا اور پُر سکون ہو، ہر انسان کو عزت ملے تو کیا اِس سے مذہب خطرے میں پڑ جائے گا؟"

احمد صاحب کا تہہ در تہہ سوال سُن کر سارے لڑکے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اُن کے سوال کا کیا جواب دیں۔

احمد صاحب نے جتنی باتیں کی تھیں اُن سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ لیکن مذہب پرستوں کا ترکش کبھی تیروں سے خالی نہیں ہوتا۔ خاص طور پر نوجوان مذہب پرستی میں پڑ جائیں تو اُن کی ذہنی ساخت تبدیل ہو جاتی ہے۔ زندگی کے بارے میں اُن کا نظریہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ مذہب کو ہر چیز پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ مذہب کے لئے جان تک دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

"خوشحالی آ جائے تو لوگ مذہب سے دور ہٹ جاتے ہیں۔ لوگ مذہبی سرگرمیوں کی بجائے ثقافتی سرگرمیوں کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ مذہب اُن کے لئے اہم نہیں رہ جاتا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔" لڑکوں میں سے چند ایک نے نقطِ اعتراض اُٹھایا۔

احمد صاحب نے اُن لڑکوں کا اعتراض سنا تو قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگے۔۔۔۔۔"اور مولویوں کا کاروبار مندا پڑ جاتا ہے۔ لوگوں میں اُن کا اثر و رسوخ کم ہو جاتا ہے۔ اِسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ لوگ غریب رہیں، بے کار رہیں، بیمار رہیں تا کہ مذہب کے سائے تلے توہم پرستی قائم رہے۔ تا کہ ان کی تعویزوں اور ٹوٹکوں کی دوکانیں چلتی رہیں۔"

احمد صاحب علاقے کے معزز آدمی تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ اور وکیل بھی چھوٹے موٹے نہیں سارے ملک میں جانے پہچانے تھے۔

اس لئے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُن کے منہ چڑھ کر بولتا لیکن اِدھر اُدھر ہرزہ سرائی سے کسی کو کون روک سکتا ہے۔ اُن کی باتوں پر اعتراض اُٹھانے والے لڑکے اُس شام احمد صاحب کی بات سن کر

اپنے گھروں کو لوٹ گئے لیکن اگلے دن کالج میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے احمد صاحب کی روشن خیالی پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔

کالج میں انہوں نے اپنے ہم خیال لڑکوں کو احمد صاحب کے خلاف بھڑکایا۔ رات کی گفتگو کو بنیاد بنا کر اُنہیں اُن کے خلاف اُکسایا۔

اُن کے اکسانے پر جذبات سے مغلوب مذہب پرست لڑکے جلوس کی شکل میں اکٹھے ہوئے اور کچہری میں احمد صاحب کے چیمبر کی طرف چل پڑے۔

وہ مسلسل احمد صاحب کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ حکومت سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ احمد صاحب کو اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے پر گرفتار کرے۔

پولیس کمشنر کو احمد صاحب کے خلاف کالج کے لڑکوں کے جلوس کا پتہ چلا تو اُس نے اُنہیں فون پر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ احمد صاحب نے پولیس کمشنر کو سرِ شام لڑکوں سے ہونے والے اپنے مکالمے کی تفصیلات بتائیں۔

پولیس کمشنر نے احمد صاحب کی بات سن کر کہا:

"احمد صاحب آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں کس قدر بے ہودگی شروع ہو چکی ہے۔ اب اس ملک میں آزادانہ مکالمے کی کوئی گنجائش نہیں۔"

احمد صاحب نے انتہائی تحمل کے ساتھ پولیس کمشنر کی بات سنی اور اُس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے دفتر سے چلے گئے۔

شہر کی پولیس نے کچہری جانے والے راستے پر جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر دیں تا کہ کالج کے بپھرے ہوئے لڑکے احمد صاحب کے چیمبر تک نہ پہنچ پائیں۔

کالج کے لڑکوں کا جلوس دیکھ کر ہر وقت مائل بہ فساد شہر کے ملاؤں کی بھی فساد پھیلانے کی رگ پھڑکی۔ چنانچہ وہ بھی اپنے اپنے طالب علموں اور مقتدیوں کو ساتھ لے کر کالج کے لڑکوں کے جلوس میں شامل ہو گئے۔

دراصل وہ عرصہ سے منتظر تھے کہ احمد صاحب کے خلاف شہر میں ہلچل ہو تو معاشرے میں روشن خیالی پھیلانے کی وجہ سے انہیں کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ جلوس میں شامل ہونے سے پہلے انہوں نے مسجدوں کے سپیکروں پر عام لوگوں سے درخواست کی کہ وہ بھی احمد صاحب کے خلاف مظاہرے میں شریک ہو کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔ چنانچہ جو ثوابِ دارین کے زیادہ رسیا تھے وہ بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مظاہرے میں شامل ہو گئے۔

مظاہرین پولیس کی سب رکاوٹیں توڑتے۔ دوکانوں کو آگ لگاتے۔ لوگوں کے کاروبار تباہ کرتے کچہری کی طرف رواں دواں رہے۔

راستے میں جگہ جگہ رک کر ملاحضرات اپنی آتشیں تقریروں سے مظاہرے میں شامل لوگوں کے جذبات بھڑکا رہے تھے۔ اُن کی تقریروں سے لوگوں کا مذہبی جوش و جذبہ بڑھتا جارہا تھا۔ وہ مسلسل احمد صاحب کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

پولیس نے پوری کوشش کی کہ مظاہرین کو روکے لیکن ناکامی کے بعد مجبوراً اُنہوں نے مظاہرین پر آنسو گیس کے گولے برسانے شروع کر دیئے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ مظاہرین اور بپھر گئے۔ ملاؤں کی تقریریں جلتی پر اور تیل ڈال رہی تھیں۔ مظاہرین نے پولیس کے ساتھ ہاتھا پائی شروع کر دی۔ پولیس نے مظاہرین پر قابو پانے کے لئے اصلی گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ دسیوں لوگ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ وہیں سڑک پر گرے اور تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو گئے۔ اُنہیں اٹھانے کے لئے نہ کوئی ایمبولینس آئی۔ نہ مظاہرے میں شامل کسی اور آدمی نے اُن کی مدد کی۔

پولیس کمشنر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مظاہرین کے کچہری پہنچنے سے پہلے احمد صاحب اپنے گھر جا چکے تھے لیکن وہ اس صورت حال پر سخت آزردہ تھے۔ اُنہیں گزشتہ شب طالب علموں کے ساتھ اپنے مکالمے پر افسوس ہُوا۔

"کاش انہوں نے اُن نوجوانوں سے بات نہ کی ہوتی۔ اُن کے باپ دادا پبلک لائف میں تھے۔ باپ اور دادا کی زندگیاں انگریزوں کے دور میں وکالت کرتے گزری تھیں۔ لیکن کسی کو ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔"

انہی سوچوں میں گم اُنہوں نے ٹی وی آن کیا تو ٹی وی پر ہنگاموں کی خبریں چل رہی تھیں۔ مظاہرین نے کئی لوگوں کی دوکانوں کو آگ لگا دی تھی۔ جس کے جواب میں پولیس نے اُن پر گولیاں چلائی تھیں۔ گولیوں سے کئی مظاہرین ہلاک ہو چکے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں زیادہ تعداد طالب علموں کی تھی۔

احمد صاحب کو خبریں سننے کا یارانہ رہا۔ اُنہوں نے ٹی وی بند کر دیا۔ مرنے والوں کو یاد کر کے اُن کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اُنہیں لگا اُن کی وجہ سے دسیوں بچے ناحق ہلاک ہو گئے ہیں۔۔۔ معصوم بچے جو پڑھ لکھ کر فارغ ہوتے تو اپنے والدین کا سہارا بنتے۔۔۔ اپنے ملک کی خدمت کرتے۔۔۔ بھرپُور زندگیاں گزارتے۔ لیکن اب وہ پولیس کی گولیوں کی نذر ہو چکے تھے۔۔۔ اور یہ سب اُن کی وجہ سے ہُوا تھا۔

وہ دکھ اور غم سے نڈھال ہو گئے۔ انہوں نے پولیس اسٹیشن کال کر کے چند مرنے والوں کے گھر کا پتہ حاصل کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ مرنے والوں کے گھر جا کر اُن سے اظہارِ افسوس کریں۔

وہ گاڑی چلاتے مرنے والے ایک لڑکے کے گھر پہنچے تو وہاں لوگوں کا مجمع لگا تھا۔ اُنہیں دیکھتے ہی مجمع میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

لوگوں نے اُن سے وہاں آنے کا سبب پوچھے بغیر احمد صاحب پر ہلہ بول دیا۔ اُنھوں نے بہت کوشش کی کہ وہ اُنہیں بتائیں کہ وہ مرنے والے کے لئے اظہارِ افسوس کرنے آئے ہیں۔ لیکن کسی نے اُن کی بات نہ سنی۔ اُنہیں جلد ہی صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا۔ اُنھوں نے گاڑی میں سوار ہو کر وہاں سے جانا چاہا لیکن مجمع نے اُن کی گاڑی کو آگ لگا دی۔

اللہ اکبر کے نعروں کے شور میں روشن خیالی کی بات کرے والا وکیل سرِعام جل کر راکھ ہو گیا۔ اُن کے جلائے جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔

اگلے دن کالج کے مذہب پرست لڑکوں نے پھر جلوس نکالا، شہر بھر کے ملاں بھی اُن کے ساتھ تھے۔ وہ احمد صاحب کی موت پر جوش وخروش سے اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے۔ نعروں کے بیچوں بیچ کہیں جلتی ہوئی گاڑی کے شعلوں سے احمد صاحب مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ پُروقار انداز میں لوگوں سے کہہ رہے تھے:

"اگر تم انسانوں کی طرح سوچنا اور عمل کرنا شروع کر دو تو تمہارے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔"

احمد صاحب کے جلے جسم کا دُھواں فضا میں لکیریں بناتا آسمان کی طرف بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔

کریم آغا

سب کا خیال تھا کریم آغا ایک عجیب و غریب آدمی ہے۔ وہ عجیب و غریب تھا یا نہیں لیکن وہ سوچتا سب سے جدا تھا۔ شاید یہ اُس کا جدا سوچنے کا انداز تھا جو اُسے دوسروں سے الگ کرتا تھا۔

اور یہ کوئی آج کل کی بات نہیں تھی جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا اُس کے خاندان کے سب افراد کا ماننا تھا کہ کریم آغا اُن سب سے مختلف ہے۔

کریم آغا کے والدِ ماجد جمیل آغا ایک مذہبی آدمی تھے۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے تہجد گزار تھے۔ اُن کا معمول تھا گرمیوں سردیوں میں صبح تین ساڑھے تین بجے اُٹھتے۔ گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم پانی سے غسل کرتے۔ اس کے بعد تہجد کے نوافل ادا کرتے۔ پھر گھنٹہ بھر قرانِ کریم کی تلاوت کرتے۔ اس کے بعد مسجد جا کر با قاعدہ جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کرتے۔ نماز کے بعد اہلِ قبور کی زیارت کو جاتے اور اس کے بعد بازار میں واقع اپنی بیکری کی دوکان پر چلے جاتے۔

کریم آغا کی والدہ ماجدہ کریماں بی بی بھی نہائت نیک شریف اور نماز روزے کی پابندی کرنے والی خاتون تھیں۔ وہ تہجد گزار تو نہیں تھیں لیکن وہ بھی جمیل آغا کے ساتھ صبح ہی صبح اٹھ جاتیں۔ اٹھ کر مسواک کرتیں، وضو کرتیں، قران پاک کی تلاوت کرتیں۔ اس کے بعد نماز ادا کرتیں۔ نماز کے بعد کشمیری چائے اور پراٹھا بناتیں۔ چائے تھرماس اور پراٹھا ٹفن کیریئر میں ڈال کر کریم آغا کے حوالے کرتیں کہ بیکری پر لے جا کر حاجی جمیل آغا کو ناشتے کے لئے دے آئے۔

حاجی جمیل آغا صبح ہی صبح اپنے بیٹے کریم آغا کو دیکھ کر ناخوش ہوتے۔ لیکن ناخوشی کا اظہار کئے بغیر اس سے تھرماس پکڑ کر کپ میں چائے ڈالتے، ٹفن کیریئر سے پراٹھا نکالتے اور ناشتہ کھانے بیٹھ جاتے۔ وہ جب تک ناشتہ کرتے کریم آغا خاموشی سے اُن کے پاس بیٹھا رہتا۔ نہ جمیل آغا اُس سے کچھ کہتے نہ وہ اُن سے کچھ کہتا۔

باپ بیٹے میں خاموشی کا یہ رشتہ ہمیشہ سے نہیں تھا۔ صرف چند سال سے باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی سچائی کی حدود کو پہچان لیا تھا۔

جمیل آغا نے شروع شروع میں اپنے بڑے بیٹے رحیم آغا کی طرح کوشش کی کہ وہ کریم آغا کو اپنے ساتھ مسجد لے جا کر نماز کی عادت ڈالیں لیکن اُن کی کوشش بسیار کے باوجود کریم آغا باپ کے ساتھ مسجد جا کر نماز ادا کرنے کا عادی نہ بن سکا۔

وہ عادتوں کے اعتبار سے ایک نرم خُو لڑکا تھا لیکن اُسے مذہب سے سخت چڑ تھی۔ جمیل آغا اور رحیم آغا اُسے پیار سے سمجھاتے کہ وہ اُن کے ساتھ مسجد جا کر نماز ادا کرے لیکن اُس کا اُنہیں ایک ہی جواب ہوتا کہ جس دن اللہ میاں اُسے خود کہے گا کہ وہ نماز ادا کرے وہ شوق سے نماز ادا کرے گا ورنہ مسجد جا کر وہ اُن کی طرح کسی ان دیکھے ان جانے خدا کے لئے نماز نہیں پڑھے گا۔

دو چار بار جمیل آغا اور حیم آغا اُسے زبردستی مسجد لے گئے لیکن جیسے ہی وہ نماز میں مشغول ہوتے کریم آغا نمازیوں کی صفیں چیرتا مسجد سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

کچھ دیر تک دوسرے نمازیوں نے اُس کی یہ حرکت برداشت کی لیکن اس کے بعد انہوں نے جمیل آغا سے صاف کہہ دیا کہ یا تو وہ حضور کے فرمان کے مطابق اُس پر سختی کریں ورنہ اُسے مسجد لانا بند کر دیں۔ جمیل آغا ایک شفیق اور مہربان باپ تھے۔ اُن کی طبعیت نے گوارا نہ کیا کہ بیٹے پر سختی کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے کریم آغا کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اُن کا خیال تھا کی تھوڑا سیانا ہو گا تو سمجھانے بجھانے سے نماز پڑھنا اور دیگر دینی امور کی پابندی شروع کر دے گا لیکن کریم آغا ایک الگ ذہن اور الگ فطرت لے کر پیدا ہوا تھا۔ اُس کا یہ سب سے جدا انداز آج کی بات نہیں بلکہ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔

سکول میں داخلے کا وقت آیا تو اُس نے کسی ایسے سکول میں داخلے سے انکار کر دیا جہاں وردی کی پابندی ہو۔ اُس کا کہنا تھا وردی پہن کر وہ دوسرے بچوں کی طرح دکھے گا۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح دکھائی نہیں دینا چاہتا۔ شہر میں کوئی ایسا سکول نہیں تھا جہاں وردی کی پابندی نہ ہو۔ آخر جمیل آغا نے اپنے

جاننے والے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب سے اسپیشل اجازت حاصل کی کہ وہ اُن کے بیٹے کو بغیر وردی سکول اٹینڈ کرنے دیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس خیال سے کہ بچہ چند دنوں یا ہفتوں میں دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی وردی پہننی شروع کر دے گا اُسے سکول میں داخلہ دے دیا لیکن کریم آغا نے نہ وردی پہننی تھی نہ پہنی۔ تاہم کریم آغا پڑھائی میں بہت اچھا ثابت ہُوا۔ چند دنوں میں اُس نے اپنے ٹیلنٹ سے اپنے تمام اساتذہ کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ آخر کار ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُسے مستقل وردی سے استثناعطا کر دیا۔

کریم آغا کا بڑا بھائی رحیم آغا بھی اسی سکول کا طالب علم تھا۔ وہ بھی انتہائی قابل لڑکا تھا۔ لیکن کریم آغا کی تو بات ہی اور تھی۔

جب کبھی اُس کے اساتذہ اُس کے ساتھ وردی پہننے کی بات کرتے وہ کہتا حسن یکرنگی میں نہیں نیرنگی میں ہے۔ زندگی کی خوبصورتی یکتائی میں نہیں تنوع میں ہے۔

وہ نماز نہ پڑھنے کی وجہ پوچھتے تو بھی یہی جواب دیتا کہ اسے ایک ساتھ ایک جیسے بندوں کا ایک جیسی حرکتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔

یہ اُس کی اُس دور کی باتیں تھیں جب کریم آغا ابھی بچہ تھا۔ اُس کی سوچیں ابھی کچی تھیں۔ لیکن جب وہ سنِ شعور کو پہنچا، اُس کی سوچوں میں پختگی آئی، تو وہ بالکل ایک آزاد انسان بن چکا تھا۔ مذہب سے آزاد، روایتوں سے آزاد اور سماجی تکلفات سے آزاد۔

اپنے بڑے بھائی رحیم آغا کی طرح اُس نے بھی کے ای کالج سے ایم بی بی ایس کیا لیکن اُس کی طرح کسی ہسپتال میں جاب کرنے کی بجائے اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے بیکری پر کام کرنا اور اپنے باپ جمیل آغا کی مدد کرنا بہتر جانا۔

باپ ہونے کی حیثیت سے جمیل آغا کا دل اپنے بیٹے کے آزادانہ رویئے پر دکھتا تھا لیکن اس کی سعادت مندی اور محبت کی وہ دل سے قدر کرتے تھے۔ وہ ہر نماز کے بعد خدا سے دعا کرتے کہ وہ کریم آغا کو راہِ راست پر ڈال دے لیکن اُن کی دعائیں کریم آغا کو کبھی اُن کی پسندیدہ حدود و قیود کا پابند نہ بنا سکیں۔

اب صورتِ حال یوں تھی کہ جمیل آغا صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اہلِ قبور کو سلام کرنے اور اُن کے لئے دعائے مغفرت کرنے کے بعد بیکری پر پہنچتے اور کریم آغا اُن کے لئے کشمیری چائے اور پراٹھالے کر وہاں آتا۔ وہ ناشتہ کر لیتے تو وہ خالی ٹفن کیریئر اور چائے کا تھرماس لے کر گھر چلا آتا۔ جمیل آغا ظہر کی نماز تک بیکری پر رہتے۔

موذن جیسے ہی مسجد کے مینار پر کھڑے ہو کر ظہر کی اذان دینی شروع کرتا اُدھر کریم آغا واپس بیکری پر پہنچ کر باپ کی جگہ کھڑا ہو جاتا اور جمیل آغا ظہر کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد روانہ ہو جاتے۔

بچپن سے جوانی تک کے سفر میں کریم آغا کی آزاد خیالی کا سارے شہر میں چرچا ہو چکا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ مذہب کو ایک بیکار مشغلہ سمجھتا ہے جس کی عملی زندگی میں کوئی افادیت نہیں۔ وہ اس ضمن میں کبھی منافقت سے کام نہیں لیتا تھا۔ وہ برملا کہتا کہ مذہب زندگی کے کمزور لمحوں میں انسان کا خود ساختہ سہارا ہے جس کی مدد سے وہ اُن کمزور لمحوں میں مصنوعی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

چنانچہ جیسے ہی ظہر کے وقت جمیل آغا بیکری سے روانہ ہوتے کریم آغا کے جاننے والے اُس سے بحث مباحثے کے لئے وہاں پہنچ جاتے۔

اس بحث و تمحیص کے نتیجے میں شہر میں اُس کے خوشہ چینوں کا ایک خاصہ بڑا حلقہ پیدا ہو چکا تھا۔ اور یہ حلقہ دن بدن پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ خاص طور پر نوجوان اُس کے افکار سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔ جو نوجوان اُس سے متاثر تھے اُنہوں نے اُسے احترام کی بنا پر ٹیچر کہنا شروع کر دیا تھا۔

کریم آغا کو اپنے لئے ٹیچر کا لقب بہت پسند تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں تھا بھی ایک ٹیچر۔ اُسے اپنے لوگوں کی توہم پرستی اور بے عملیت پر بہت افسوس ہوتا۔

اُس کے چاہنے والوں نے اُس کے لئے باقاعدہ ایک بیٹھک کا انتظام کر دیا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد جمیل آغا مسجد سے بیکری پر لوٹتے۔ چند منٹوں میں سارے دن کا حساب کتاب کر کے گھر روانہ ہوتے اور کریم آغا بیکری بند کر کے بیٹھک پہنچ جاتا۔ وہاں شہر کے بہت سے نوجوان پہلے سے اُس کے منتظر ہوتے۔

بیٹھک میں بیٹھنے کے لئے وال ٹو وال قالین بچھا تھا۔ تین دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ صرف ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا۔

کریم آغا کے وہاں آتے ہی وہ سارے کے سارے دیوار کے ساتھ لگے گاؤ تکیوں کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ کریم آغا اکلوتے گاؤ تکیے کے ساتھ بیٹھ جاتا اور پھر کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کرتا۔ اُس کے بولنے کے انداز سے لگتا جیسے پہاڑ سے آبشار کا پانی گر رہا ہوں۔ ٹھنڈا، میٹھا، رواں اور شفاف پانی۔ جو سننے والوں کے ذہنوں کی گرد صاف کرتا چلا جاتا۔

اُس کی گفتگو عام طور پر مذہب، فلسفے، آرٹ اور نفسیات کے موضوعات کے بارے میں ہوتی۔ وہ کتابوں کی بجائے زیادہ تر انسانوں کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو اپنی گفتگو کی بنیاد بناتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے کے مصداق اُس کی سب باتیں سامعین کے دل میں اُترتی چلی جاتیں۔

ایک شب کریم آغا حسبِ معمول بیکری بند کر کے بیٹھک پہنچا تو جمیل آغا بھی اُس کے ساتھ چلے آئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر اُن کے بیٹے میں ایسی کیا بات ہے جو لوگ اس طرح اُس کی گفتگو سننے کے لئے ہر شب اکٹھے ہوتے اور یوں دیوانوں کی طرح اُس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔

دونوں باپ بیٹا بیکری سے چلتے بیٹھک پہنچے تو چالیس پچاس کے قریب نوجون گاؤ تکیوں کے سہارے تین اطراف دیواروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ صرف ایک گاؤ تکیہ تھا۔ وہ سب کریم آغا اور جمیل آغا کو دیکھ کر اُن کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔

کریم آغا نے اپنا گاؤ تکیہ جمیل آغا کو پیش کیا اور خود اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ حسبِ معمول اُس نے تمام حاضرین پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

"علم مسلسل ارتقا پذیر رہتا ہے۔ ارتقا کا یہ عمل عمودی اور اُفقی سطح پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ عمل ہمہ وقت تازہ ذہنوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ جس کلچر میں اُسے تازہ ذہن ملتے ہیں یہ وہاں ہجرت کر جاتا ہے۔ جب تک وہ کلچر علم کے اِس ارتقائی عمل کو توانائی عطا کرتا ہے علم وہاں پھَلتا پھُولتا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ کلچر کمزور ہونے لگتا ہے۔ علم نئے طاقت پذیر کلچر میں ہجرت کر جاتا ہے۔

اس طرح علم خود کو نہ صرف زوال پذیر ہونے سے بچاتا ہے۔ بلکہ اپنے اُفقی اور عمودی ارتقا کا سفر جاری رکھتا ہے۔ جو لوگ علم کے اِس ارتقائی عمل میں جب تک اُس کے ساتھ چلتے ہیں وہ دنیا میں کامیاب و کامران رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنی فکری اور سماجی ہٹ دھرمیوں کی وجہ سے علم کے ارتقائی عمل میں اُس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیتے ہیں وہ ناکارہ ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ گرد و غبار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

زندگی یک طرفہ سفر ہے۔ اِس میں کوئی یُوٹرن نہیں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام زندگی کے اس سفر میں وہ کسی نہ کسی مقام پر اٹک جاتے ہیں۔ وہ رُک کر سستانا چاہتے ہیں۔ علم کا ارتقا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ اُس کے ہمراہ چلتے رہیں۔ لیکن اُن کی فکری اور سماجی ہٹ دھرمیاں اُن کی رفتار کو سست کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر رُک جاتے ہیں۔ اور پھر کسی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں۔ کبھی اُن کی قبر پر کتبہ لگ جاتا ہے کہ یہاں فلاں ابنِ فلاں دفن ہے۔ اور کبھی ہمیشہ کے لئے گمنام ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے اِس سفر میں افراد قبروں میں دفن ہوتے ہیں۔ لیکن ثقافتوں اور تہذیبوں کا مدفن تاریخ ہے۔ جو ثقافتیں اور تہذیبیں علم کے لئے بانجھ ہو جاتی ہیں۔ اس کے افقی اور عمودی ارتقا میں کردار ادا کرنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ وہ تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہیں۔ اُن کی قبروں پر علم کے ارتقا میں ادا کئے گئے کردار کے مطابق کتبہ نصب ہو جاتا ہے۔ ورنہ وہ ہمیشہ کے لئے گمنام ہو جاتی ہیں۔ کوئی یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ وہ کون تھے اور اُن کا مسکن کن غاروں میں تھا۔"

کریم آغا بول رہا تھا۔ گاؤ تکیوں کے ساتھ بیٹھے نوجوان اُس کی گفتگو پورے انہماک کے ساتھ سُن رہے تھے۔ جمیل آغا بھی قریب بیٹھے اپنے بیٹے کریم آغا کی گفتگو سُن رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر بیٹھک میں جلتی روشنیوں کی لو پر چھائیاں بن کر لرز رہی تھی۔

کریم آغا بول رہا تھا اور جمیل آغا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آج وہ اپنے بیٹے کریم آغا کو ایک مختلف روشنی میں دیکھ رہے تھے۔

کریم آغا نے گفتگو ختم کی تو وہاں بیٹھے حاضرین کی طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کریم آغا انتہائی محبت سے اُن کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

جمیل آغا نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ بیٹھک میں بیٹھے سب نوجوانوں کی آنکھیں اور کان جمیل آغا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لیکن اُنہوں نے کہا تو صرف اتنا: "مجھے یہاں آکر بہت خوشی ہوئی ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ بیٹھنا اور کریم آغا کی گفتگو سُننا اچھا لگا ہے۔ کیا میں روزانہ اِس بیٹھک میں شامل ہو سکتا ہوں۔"

جمیل آغا کا سوال سُن کر سب حاضرین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بیٹھک میں جلتی روشنیاں اور تیز ہو گئیں۔ کریم آغا نے آگے بڑھ کر جمیل آغا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

جمیل آغا نے کریم آغا کو اپنی باہوں میں لے کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر کہنے لگے: "کریم آغا تم جو بھی، جیسے بھی ہو، مجھے تم پر فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے تم جیسا بیٹا عطا کیا ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ وہ سب کو تم جیسے بیٹے عطا کرے۔"

جمیل آغا کی بات سن کر زندگی میں پہلی بار کریم آغا کو محسوس ہُوا کہ اُس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔

افیونی

پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ لے کر سید صاحب پہلے دن بطور وزیر اعظم دفتر پہنچے تو سارے اسٹاف نے اُن کا خوش دلی سے استقبال کیا۔ اُن کے پرائیوٹ سکریٹری نے باقی اسٹاف ممبران سے اُن کا تعارف کرایا۔ اسٹاف ممبران سے تعارف کے بعد پرائیوٹ سکریٹری نے وزیر اعظم سے چائے پانی کے لئے پوچھا۔ انہوں نے مسکرا کر پرائیوٹ سکریٹری کا شکریہ ادا کیا اور جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

پرائیوٹ سکریٹری سر جھکائے ، ہاتھ میں نوٹ بک پکڑے، وزیر اعظم کے پیچھے چلتا اُن کے دفتر میں داخل ہوا تو اُنہوں نے اسے دروازہ بند کرنے کے لئے کہا۔

اِس سے پہلے کہ پرائیوٹ سکریٹری دروازے کے طرف بڑھتا دروازے کے پاس کھڑے اردلی نے دروازہ بند کر دیا۔

وزیرِ اعظم نے اُس کو اپنی روزانہ کی ضروریات کی فہرست تھماتے ہوئے کہا کہ بطور پرائیوٹ سکریٹری وہ اُس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اُن کی مطلوبہ اشیا ہمہ وقت فراہم رکھا کرے گا۔

پرائیوٹ سکریٹری نے وزیر اعظم کی روز مرّہ کی ضروریات کی عطا کردہ فہرست پر نظریں ڈالیں تو اُسے سب سے اوپر افیون لکھی دکھائی دی۔

"افیون؟" اُس نے استفہامیہ انداز میں وزیرِ اعظم کی طرف دیکھا۔ "ہاں بھائی۔ تم جانتے ہو میں صرف ملک کا وزیرِ اعظم نہیں۔ میری کئی حیثیتیں ہیں۔ میں حسنی حسینی سید ہوں۔ گدی نشیں ہوں۔ میرے ہزاروں مرید ہیں۔ اُن کے آباؤ اجداد میرے آباؤ اجداد کے مرید تھے۔ اب وہ میرے مرید ہیں۔ وہ میرے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ میرے پیروں اور ہاتھوں کو چومتے ہیں۔ مجھے نذرو نیاز پیش کرتے ہیں۔

یہ خاصہ دشوار کام ہے۔ اس لئے میں اپنے دن کا آغاز افیون کھانے سے کرتا ہوں۔ اگر افیون نہ کھاؤں تو اتنے سارے لوگوں سے سجدے اور نظر و نیاز وصول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب وزارت عظمیٰ کے بعد میری ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ہزاروں مریدوں کے علاوہ اب میرے ناتواں کندھوں پر ملک کے کروڑوں عوام کا بوجھ بھی آن پڑا ہے۔ اِس لئے اب تو افیون کے بغیر دن کا آغاز کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وزیرِ اعظم کی بات سُن کر سکریٹری نے اثباتیہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "لیکن سر یہاں دارالخلافے میں افیون کی کوئی دوکان نہیں ہے۔ آج تک کسی وزیرِ اعظم نے افیون استعمال نہیں کی تھی۔ اِس لئے مجھے پتہ کرنا پڑے گا کہ افیون کہاں سے مل سکتی ہے؟"

وزیرِ اعظم نے پرائیوٹ سکریٹری کی بات سُنی تو مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "افیون کا حصول کوئی مشکل کام نہیں۔ میرے شہر میں افیون کا ٹھیکہ میرے پاس ہے۔ میری کیبنٹ کے کئی منسٹر حسنی حسینی سید ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ افیون استعمال کرتے ہیں۔ تم اُن کے پرائیوٹ سکریٹریوں سے بھی پتہ کر لو۔ اگر اُنہیں بھی اپنے باسوں کے لئے افیون چاہئے تو تم اُن کے لئے بھی میرے ٹھیکے سے افیون منگوا لیا کرو۔ اُن کا حصہ انہیں پہنچا دیا کرو اور باقی میرے لئے اسٹاک میں حاضر رکھو۔ میں کبھی کبھار دن میں ایک سے زیادہ بار بھی افیون کھانے کا عادی ہوں۔

صدر صاحب سے بھی پتہ کر لینا۔ وہ بھی افیون کھاتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اُن کو بھی یہیں سے افیون سپلائی کر دیا کرو۔ لیکن دھیان رکھنا کاغذوں میں افیون کا لفظ نہ آنے پائے۔ ہم سیاسی لوگ ہیں۔ ایسی باتیں پبلک کو پتہ نہیں چلنا چاہیں۔ یہاں دفتر میں بھی افیون کا سارا سلسلہ تمہارے کنٹرول میں ہو تا کہ کسی اور کو پتہ نہ چلے کہ میں افیون کھاتا ہوں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ افیون کا بل ساتھ ہی ساتھ سرکاری کھاتے سے ادا کر دیا کرو کیونکہ اب میں وزیرِ اعظم ہوں۔ میری تمام ضروریات کی ذمہ داری قوم اور قومی خزانے پر ہے۔"

پرائیوٹ سکریٹری نے وزیرِاعظم سے وعدہ کیا کہ وہ آج ہی ہیلی کاپٹر بھیج کر اُن کے شہر سے کافی ساری افیون منگوا لے گا۔ تاکہ اُن کے لئے افیون کا اسٹاک موجود رہے اور اُنہیں بوقتِ ضرورت فوراً دستیاب ہو سکے۔

پرائیوٹ سکریٹری نومنتخب وزیرِاعظم سے روز مرّہ کے لئے ہدایات لے کر اُن کے دفتر سے اپنے کمرے میں داخل ہُوا تو اُس کے پی اے نے اُسے بتایا کہ کئی وفاقی وزیروں اور صدرِ محترم کے سکریٹری اُس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

اُس نے بات کرنے والوں کی لسٹ دیکھی تو تقریباً سبھی گدی نشین حسنی حسینی سید وزیروں کے پرائیوٹ سکریٹریوں کے پیغامات تھے۔

لسٹ دیکھ کر اُسے خیال گزرا کہ اُن کا مسئلہ بھی اُس کے مسئلے سے ملتا جلتا ہو گا۔ یقناً اُن کو بھی اپنے باسوں کے لئے افیون چاہئے ہو گی۔

چنانچہ اُس نے جلدی سے وزیرِاعظم کے ایئر اسکواڈ میں سے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو طلب کیا اور اُسے حکم دیا کہ وہ فوراًوزیرِاعظم کے شہر جائے اور وہاں افیون کے ٹھیکے پر جتنی افیون موجود ہو سب لیتا آئے۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے پہلے کبھی اِس طرح کے احکامات نہیں سنے تھے۔ اُس نے تعجب آمیز نظروں سے وزیرِاعظم کے پرائیوٹ سکریٹری کی طرف دیکھا۔ پرائیوٹ سکریٹری کی نظروں سے جھلکتی عجلت اور خاموشی کو امرِیقینی جان کر وہ فوراًوزیرِاعظم ہاؤس میں بنے ہیلی پیڈ کی طرف بھاگا اور جلدی سے ہیلی کاپٹر اُڑا کر وزیرِاعظم کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ پرواز کے بعد وہ وزیرِاعظم کے شہر پہنچا تو اُسے شہر سے باہر ایک کھلی جگہ دکھائی دی۔ اُس نے وہیں ہیلی کاپٹر اتار لیا۔ جس جگہ اُس نے ہیلی کاپٹر اُتارا شہر کا پولیس اسٹیشن بھی وہیں پاس ہی تھا۔

ہیلی کاپٹر کو لینڈ کرتے دیکھ کر لوکل پولیس کے چند سپاہی فوراً وہاں آ پہنچے۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اُن سپاہیوں میں سے ایک کو کہا کہ وہ وزیر اعظم کے دفتر سے آیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ افیون کے ٹھیکے پر جس قدر افیون دستیاب ہے دارالخلافہ لے جائے۔ کیونکہ وہاں افیون کی سخت ضرورت ہے۔

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کی بات سن کر پولیس والوں میں سے ایک فوراً افیون کے ٹھیکے کے طرف بھاگا۔ وہ بھاگتا بھاگتا افیون کے ٹھیکے پر پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ آج صبح ہی ایک اور ہیلی کاپٹر آیا تھا۔ اُس کا پائلٹ ٹھیکہ کھلوا کر ساری افیون لے گیا ہے۔

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو اِس صورتِ حال سے خاصی مایوسی اور پریشانی ہوئی۔ مایوسی اِس بات سے کہ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ فلائی کر کے یہاں پہنچا تھا لیکن خالی ہاتھ واپس جا رہا ہے۔ پریشانی اِس بات پر کہ آج وزیر اعظم کا جاب پر پہلا دن ہے۔ یہ دفتر میں وزیرِ اعظم کے پہلے دن کا پہلا آرڈر ہے۔ وہ اِس آرڈر کی تکمیل میں ناکام رہا ہے۔ اب وہ وزیرِ اعظم کے پرائیوٹ سکریٹری کو کیا جواب دے گا۔ پرائیوٹ سکریٹری وزیرِ اعظم کو کیا بتائے گا۔

اُس نے اپنے ذہن پر بہت زور ڈالا کہ کسی اور شہر میں واقع افیون کے ٹھیکے سے افیون لیتا جائے لیکن اُسے کچھ اندازہ نہ ہُوا کہ اور کس کس شہر میں افیون کے ٹھیکے ہیں۔

دراصل بات یہ تھی کہ آج تک جتنے وزیر اعظم یا صدر دارالخلافے میں وارد ہوئے تھے وہ یا تو نشے سے پرہیز کرتے تھے اور اگر اُن میں سے کسی کو نشے کا شوق تھا تو وہ افیون نہیں بلکہ شراب کے نشے سے شغل فرماتا تھا۔

وہ سابقہ حکومتوں کے کئی حسنی حسینی سید وزیروں، وزیر اعظموں اور صدروں کو جانتا تھا جو شراب پیتے تھے لیکن اُن کی نشے کی یہ عادت اُن تک محدود تھی۔ اُن کے اسٹاف کو اندازہ تک نہیں ہوتا تھا کہ موصوف نے شراب پی ہے۔ لیکن اب تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ وزیرِ

اعظم کے پرائیوٹ سکریٹری نے اُسے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے فاصلے پر وزیرِ اعظم کے شہر بھجوایا تھا تاکہ وہاں سے افیون کے ٹھیکے سے ساری افیون اٹھالائے۔

اُس کا ہیلی کاپٹر دارالخلافہ کی طرف محوِ پرواز تھا اور اُس کا ذہن سوچوں میں اُلجھا تھا۔ اُسے یکے بعد دیگرے نشہ کرنے والے سب صدر اور وزیر اعظم یاد آ رہے تھے۔ شراب اُن کے دفتر اور گھر میں موجود رہتی تھی۔ جو پینا چاہتا تھا اُسے فوراً پیش کر دی جاتی تھی۔

اُس نے چاہا کہ وہ کنٹرول ٹاور سے رابطہ کر کے پرائیوٹ سکریٹری کو افیون نہ ملنے کی پیشگی اطلاع دے دے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جب تک پرائیوٹ سکریٹری تک اُس کا پیغام پہنچے گا وہ خود وہاں پہنچ جائے گا۔ دوسرا اُسے پرائیوٹ سکریٹری نے صبح ہی منع کر دیا تھا کہ افیون کی بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ پڑے کیونکہ ایسی صورت میں اُس کو ملازمت سے برخاست کیا جاسکتا ہے۔

اِنہی سوچوں میں گم وہ ہیلی کاپٹر اُڑاتا دارالخلافہ واپس پہنچا۔ تھکے اعصاب کے ساتھ ہیلی پیڈ پر ہیلی کاپٹر اتار کر منہ لٹکائے پرائیوٹ سکریٹری کے دفتر پہنچا تاکہ اُسے افیون نہ ملنے کی اطلاع دے۔

وہ افیون نہ ملنے کی بُری خبر سُنانے پرائیوٹ سکریٹری کے دفتر میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ وہ فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ گفتگو سے لگتا تھا اُس کی کسی دوسرے حسنی حسینی سید وزیر کے پرائیوٹ سکریٹری سے بات ہو رہی تھی۔ موضوعِ گفتگو افیون ہی تھی۔ پرائیوٹ سکریٹری فون پر کہہ رہا تھا:

"اچھا ہوا۔ صدر صاحب کے اے ڈی سی نے دارالخلافے میں افیون کی سپلائی کی ذمہ داری خود لے لی ہے۔ اب وزیر اعظم اور باقی وزرا بھی اپنی ضرورت کے لئے صدر صاحب کے اے ڈی سے ضرورت کے مطابق افیون لے سکتے ہیں۔"

پرائیوٹ سکریٹری نے فون رکھا تو ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اُسے اپنے ناکام لوٹنے کی اطلاع دینا چاہی لیکن اُس کے منہ کھولنے سے پہلے پرائیوٹ سکریٹری نے اُسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ اُس کے وزیرِ

اعظم کے شہر میں افیون کے ٹھیکے پر پہنچنے سے پہلے صدر صاحب کے اے ڈی سی نے صدر صاحب کے کہنے پر ٹھیکے سے ساری افیون پہلے ہی اُٹھوا لی تھی۔ چنانچہ وہ متفکر نہ ہو۔

پھر پرائیوٹ سکریٹری نے ہنستے ہوئے کہا: "شکر ہے کہ اب صدر، وزیرِاعظم اور حسنی حسینی سید وزیروں کی افیون کی سپلائی کی ذمہ داری خود صدر صاحب کے اے ڈی سی نے لے لی ہے۔ کم از کم ہمیں اب اِس افیونی وزیرِاعظم اور اس کے وزیروں کے لئے افیون کی فکر نہیں کرنی پڑے گی۔"

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ اور دوسرے اسٹاف نے پرائیوٹ سکریٹری کی طرف اِس طرح معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔۔۔۔" اُنہوں نے کچھ نہیں سنا۔ کچھ نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتے کہ صدر، وزیرِاعظم اور بہت سے وزیر افیونی ہیں۔"

بوجھ

شیخ صاحب اپنے دوستوں میں ایک نرم خُو، نیک دل اور شریف النفس آدمی کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ہر کوئی ان کی دل سے عزت کرتا تھا۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ بنگلہ، گاڑی، ڈرائیور، نوکر چاکر، محبت کرنے والی بیوی اور سعادت مند بچے۔

لیکن شیخ صاحب کی زندگی ہمیشہ سے ایسے نہیں تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ بہت مشکل سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔

میٹرک میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ میٹرک کے امتحان کے نتائج کا اعلان نہیں ہُوا تھا کہ والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ کوئی قریبی عزیز واقارب نہیں تھے۔ بس دور کی ایک پھوپھو تھیں۔ اتنی دور کی کہ شیخ صاحب کے والد کو پھوپھو سے رشتہ بتاتے ہوئے کئی خاندانی گتھیوں کے پیچ وخم کی وضاحت کرنا پڑتی۔

پہلے والد اور پھر اچانک والدہ کی وفات کے بعد پھوپھو نے شیخ صاحب کی نگہداشت کی ذمہ داری سنبھالنا چاہی لیکن اُنہوں نے نوعمر ہونے کے باوجود پھوپھو کی نگرانی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ والدہ کی قل خوانی کے دن اُنہوں نے پھوپھو سے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے آبائی گھر میں اکیلے رہیں گے۔ پھوپھو نے سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی لیکن شیخ صاحب نے اُن کی ایک نہ چلنے دی اور یہ کہہ کر اُنہیں گھر سے رخصت کیا کہ اگر اُنہیں اُن سے کسی قسم کی مدد درکار ہو گی تو وہ فوراًاُن کے ہاں پہنچ جائیں گے۔

پھوپھو نے بوجھل دل اور روتی آنکھوں کے ساتھ گلے لگا کر شیخ صاحب کو خدا حافظ کہااور اپنے گھر سدھاریں۔ چند دن بعد میٹرک کا نتیجہ نکلا تو شیخ صاحب امتیازی پوزیشن میں پاس ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم جاری رکھیں لیکن والدین کی وفات کے بعد اُن کا سب سے بڑا مسئلہ پڑھائی نہیں بلکہ نان نفقے کے بندوبست کا تھا جس سے وہ جسم وجاں کا رشتہ قائم رکھ سکیں۔ اِس مقصد کے لئے اُنہوں نے ترکے میں

چھوڑی اپنے والدین کی جمع پُونجی کا جائزہ لیا۔ گھر میں چھوٹے موٹے گھریلو سامان کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تاہم والدہ کے کچھ سونے کے زیورات تھے۔ شاید دلہن بنتے وقت اُن کے ماں باپ نے پہنائے ہوں گے۔ شیخ صاحب نے بوجھل دل کے ساتھ وہ زیور شہر میں سنار کے پاس بیچ دیئے۔ اُن کی والدہ نے ساری عمر وہ زیور چھاتی سے لگا کر رکھے کہ بیٹے کی شادی کریں گی تو بہو کو پہنائیں گی۔

والدہ کے زیورات بیچ کر شیخ صاحب کو اتنے پیسے مل گئے کہ اُنہوں نے شہر کے مین بازار میں منیاری کی ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی۔

دوکان کھولنے سے اُن کی زندگی میں کچھ نظم پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ وہ صبح ہی صبح اُٹھ جاتے۔ نہاد دھو کر کپڑے بدلتے اور دوکان پر پہنچ جاتے۔ پاس ہی واقع چائے کے ایک کھوکھے سے رس اور چائے منگوا کر ناشتہ کرتے۔ پھر دوکان کا سامان سیدھا پدھرا کر کے اپنی سیٹ پر براجمان ہو جاتے۔ دن بھر گاہکوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ جب وقت ملتا پاس ہی واقع ایک ہوٹل سے دوپہر کا کھانا کھا لیتے۔

اِس طرح گاہکوں کی آمد و رفت میں اُن کا دن گزر جاتا۔ سرِ شام دوکان بند کرتے اور سونے کے لئے گھر روانہ ہو جاتے۔ بستر پر لیٹتے تو ماں باپ کی یاد ستاتی۔ لیکن دن بھر کی تھکن اُنہیں فوراً نیند کی وادیوں میں پہنچا دیتی۔

یوں رفتہ رفتہ اُن کی زندگی ایک خاص معمول پر آ گئی۔۔۔اور وہ معمول تھا ہفتے میں چھ دن دوکان کھولنا، ساتویں دن صبح ہی صبح ٹرین پکڑ کر لاہور جانا اور دوپہر دیر گئے دوکان کے لئے سودا سلف خرید کر واپس لوٹنا۔

چند برس میں شیخ صاحب کی دوکان خوب جم گئی۔ کاروبار خوب چلنا شروع ہو گیا۔ اُنہوں نے کام کرنے کے لئے ایک دو ملازم رکھ لئے۔ ایک دن اُنہیں خیال آیا کہ کاسمیٹکس کا جو سامان وہ لاہور خریدنے جاتے ہیں اِس میں سے بہت سا وہ خود بنوا سکتے ہیں۔۔۔اور وہ بھی شاید سستا اور متنوع اسٹائلز کے ساتھ۔

اپنا مال خود بنوانے کا خیال شیخ صاحب کی زندگی میں گہرے کالے بادلوں میں چمکنے والی بجلی کی طرح کوندا۔ جس پر اُنہوں نے فوراً عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اِس مقصد کے لئے اُنہوں نے شروع میں یہ کام جاننے والی دو تین خواتین ملازم رکھیں اور اپنے گھر پر کاسمیٹکس اور ہوزری کا سامان تیار کروانا شروع کر دیا۔

وقت کے ساتھ علاقے میں منیاری کے سب دوکانداروں نے لاہور جانے کی بجائے اُن کا بنایا ہوا کاسمیٹکس اور ہوزری کا سامان خریدنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی بنائی ہوئی اشیا کی طلب اتنی بڑھی کہ اُنہیں گھر سے الگ ایک چھوٹی سی فیکٹری لگانی پڑی۔

ایک بار فیکٹری لگی تو شیخ صاحب نے کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ رفتہ رفتہ علاقے کے دوکانداروں میں مال فروخت کرنے کے علاوہ پورے ملک سے اُن کے بنائے ہوئے مال کے آرڈر آنا شروع ہو گئے۔ اس طرح دو کمروں کے گھر میں شروع ہونے والا کام پہلے ایک چھوٹی سی فیکٹری اور پھر شہر کی سب سے بڑی کمپنی شیخ کاسمیٹکس میں بدل گیا جس میں بنے مال کی پورے ملک میں دھوم تھی۔

شیخ کاسمیٹکس میں بنے مال کی ملک میں دھوم ہوئی تو بڑے بڑے گھروں سے شیخ صاحب کے لئے رشتے آنا شروع ہو گئے۔ کاروبار میں کامیابی سے ان کی زندگی میں روپے پیسے کی ریل پیل تو ہوئی ہی تھی وہ دیکھنے میں بھی خاصے دلکش اور خوبصورت شکل وصورت کے مالک تھے۔ چنانچہ ان کی شادی ایک بہت بڑے کاروباری اور بااثر گھرانے میں طے پا گئی۔

نسبت طے ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد شیخ نے صاحب نے انتہائی دھوم دھام سے شادی کی اور اپنی دلہن کو بیاہ کر گھر لے آئے۔

چند ہی برسوں میں اللہ تعالیٰ نے شیخ صاحب کی زندگی کو خوشیوں سے مالامال کر دیا۔ خوشیاں اُن کے انگ انگ سے پھوٹنے لگیں۔ اُن کی زندگی میں کامیابیوں کے رنگ اس طرح چمکے کہ شیخ صاحب کا ہر اُٹھنے والا پاؤں زمین پر پڑنے کی بجائے آسمان پر پڑنے لگا۔

وقت کے ساتھ اُن کے ہاں تین بچے پیدا ہوئے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ شیخ صاحب اور اُن کی بیگم بچوں کو دیکھ کر جیتے۔ اُنہوں نے بچوں کی تربیت اتنی محبت سے کی کہ اُن کی ہر خواہش کو اُنہوں نے حکم جانا۔ اُن کی بہترین تربیت کرنے کے لئے شیخ صاحب اور اُن کی بیگم نے فیملی پلاننگ کے زرّیں اصولوں پر عمل کرتے ہوئے آئندہ بچوں کی پیدائش کا عمل بھی روک دیا۔

اُن کی بیگم ایک آدھ بار پھر امید سے ہوئیں لیکن اُنہوں نے باہمی مشورے سے ڈاکٹر کو کہہ کر حمل گرا دیا۔ حالانکہ اُنہیں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ وسائل بھی لا محدود تھے۔ نوکر چاکر بھی بے شمار تھے۔ بنگلہ اتنا بڑا تھا کہ اُس میں کئی خاندان ایک وقت میں سما سکتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ تین بچوں پر اکتفا کریں گے۔ اُن کی بہترین تربیت کریں گے۔ وہ خواب جو اُن کے والدین نے اُن کے لئے دیکھے تھے اُن کی تکمیل وہ اپنے بچوں کے ذریعے کریں گے۔ انہیں پڑھائیں گے، لکھائیں گے اور بڑے آدمی بنائیں گے۔

چنانچہ کاروبار سے جتنا وقت بچتا شیخ صاحب اپنے بچوں کے ساتھ گزارتے۔ خود اُنہیں اسکول لے کر جاتے۔ چھٹی کے وقت اسکول سے اٹھاتے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر اُنہیں اسکول کا کام کرواتے۔ شام کے وقت پارک جاتے۔ وہاں کھیلوں میں اُن کے ساتھ شامل ہوتے۔ رات کے وقت ٹیبل پر بیٹھ کر اکٹھے ڈنر کرتے۔ ڈنر کے بعد بچوں کو کہانیوں کی کتابیں پڑھ کر سُناتے۔

اس طرح اُن کے تینوں بچے جوان ہوئے تو اُن کو دیکھ کر وہ خوشی سے پھُولے نہ سماتے۔ دونوں بیٹوں اور بیٹی نے ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹری کی ڈگریاں لیں۔

آخر ایک دن آیا کہ اُنہوں نے بڑے بیٹے کی دھوم دھام سے شادی کی۔ اُن کی بہو ایک بہت بڑے سرکاری افسر کی بیٹی تھی۔ وہ میڈیکل کالج میں اُن کے بیٹے کی کلاس فیلو تھی۔

شادی کے بعد شیخ صاحب نے بیٹے اور بہو کے لئے شہر میں ایک بہت بڑا کلینک کھولا۔ دونوں کی ٹریننگ زچہ اور بچہ کی بیماریوں میں تھی۔ چنانچہ جلد ہی اُن کا کلینک شہر میں بچوں کی بیماریوں کا معروف ترین کلینک بن گیا۔

دونوں کی شادی ہوئے سال بھر کا عرصہ گزرا تو اُن کی بہو نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔ شیخ صاحب اور اُن کی بیوی پوتے کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔

کلینک میں مصروفیت کی وجہ سے اُن کے بیٹے اور بہو نے بچے کے لئے ایک آیا رکھنا چاہی لیکن شیخ صاحب کی بیوی نے یہ کہہ کر آیا رکھنے سے منع کر دیا کہ وہ خود اپنے پوتے کی دیکھ بھال کریں گے۔

چنانچہ اب شیخ صاحب اور اُن کی اہلیہ کا زیادہ وقت پوتے کی دیکھ بھال کرتے گزرتا۔ چند ہفتوں تک تو بچہ سارا دن دودھ پیتا اور سویا رہتا لیکن جب ہفتے مہینوں میں بدلے تو بچے کو اِرد گرد کے ماحول کا اندازہ ہونا شروع ہُوا۔ اُسے ماں باپ اور دادا دادی کی پہچان ہوئی۔ اپنے نام کی شناخت ہوئی۔ دادا دادی اُس کا نام لے کر اُسے آواز دیتے تو وہ فوراً اُن کی طرف دیکھتا۔ ہاتھ پاؤں مارتا۔ مسکراتا اور کھیلتا۔ ہمک کر اُن کی گود میں آجاتا۔ بچے کی معصوم حرکتوں سے دادا دادی دونوں نہال ہو جاتے۔

شیخ صاحب کا بیٹا اور بہو اپنے ماں باپ کی پوتے کے ساتھ محبت دیکھتے تو دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ اُس نے انہیں اتنی محبت کرنے والے ماں باپ دیئے ہیں۔

جیسے جیسے بچہ بڑا ہونا شروع ہُوا اُس کی معصومانہ حرکتیں دادا دادی کے لئے راحتِ جان بنتی گئیں۔ وہ ایک لمحہ پوتے کو اپنے نظروں سے اُوجھل نہ ہونے دیتے۔ خاص طور پر شیخ صاحب تو زیادہ سے زیادہ وقت اپنے پوتے کے ساتھ گزارتے۔ وہ اُس کو ہنستے دیکھتے تو خوشی سے کھل اٹھتے۔ اگر کسی وجہ سے وہ رونے لگتا تو وہ کوشش کرتے کہ جلد سے جلد اُس کے رونے کی وجہ جانیں اور اُسے پھر سے ہنستا کھیلتا دیکھیں۔

پوتے کے ساتھ شیخ صاحب کی محبت اُن کے ہر عمل سے جھلکتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے پوتا سیانا ہو رہا تھا اُن کی پوتے سے محبت میں ہلکے سے غم کا تاثر بھی اُبھرنے لگا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے۔ وہ

کھل کھلا کر ہنستا تو شیخ صاحب بھی ہنسنے لگتے۔ لیکن اُن کی ہنسی میں ہلکا سا دکھ اور تاسف کا عنصر شامل ہوتا۔ کچھ عرصہ بعد اُن کی بیگم اور بچوں نے بھی محسوس کیا کہ پوتے کے ساتھ کھیل کود میں شیخ صاحب کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں ہلکا سا غم کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

ایک دن ڈنر ٹیبل پر بیٹھے شیخ صاحب کے بچوں نے اُن کی مسکراہٹ میں چھپے ہلکے سے ملال کا سبب پوچھا لیکن شیخ صاحب بات ٹال گئے وہ کھانا کھاتے رہے اور ساتھ ساتھ پوتے کے ساتھ کھیلتے رہے۔ لیکن اُن کے چہرے پر حزن کے اثرات اسی طرح نمایاں رہے۔

کئی دنوں بعد شیخ صاحب کے بیٹے اور بہو نے اُن کے چہرے پر وہی کرب کے اثرات دیکھے تو اُنہوں نے اصرار کیا کہ وہ اُنہیں وجہِ ملال بتائیں۔ بیٹے اور بہو کا اصرار حد سے بڑھا تو شیخ صاحب نے اُن سے مخاطب ہو کر پوچھا کیا وہ اپنے ہسپتال میں حمل گراتے ہیں؟ بیٹے اور بہو نے بیک زبان کہا کہ اُنہوں نے ایم بی بی ایس میں زچہ و بچہ کی بیماریوں کی ٹریننگ لی تھی۔ حمل گرانا بھی ان کی ٹریننگ میں شامل تھا۔

شیخ صاحب نے بیٹے اور بہو کی بات سنی تو کہنے لگے کہ وہ اپنے پوتے کی مسکراہٹ اور معصوم حرکتیں دیکھتے ہیں تو اُنہیں اپنا وہ بچہ یاد آجاتا ہے جس کا حمل اُن کی ماں نے اُن کے کہنے پر گرایا تھا۔

اتنا کہہ کر شیخ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اُنہوں نے اپنے بچے کو قتل کیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ بیٹی تھی یا بیٹا۔

وہ کہہ رہے تھے۔۔۔" جب حمل کش دوائی نے اُس ننھے سے وجود کے حصے بخرے کئے ہوں گے تو اُس پر کیا گزری ہو گی۔۔۔ کاش اُنہوں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ اُنہیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اللہ نے اُنہیں اتنی دولت عطا کی تھی کہ وہ باقی بچوں کی طرح اُس کی بھی پرورش آسانی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے اُسے قتل کر دیا۔ اگر وہ بچہ پیدا ہوتا تو وہ بھی اُن کے پوتے کی طرح معصومانہ حرکتیں کرتا۔۔۔۔"

بیٹے اور بہو نے شیخ صاحب کو تسلی دی کہ ماں کے پیٹ میں بچہ صرف گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔ اُسے بچہ بنتے ہوئے وقت لگتا ہے۔ لیکن اُن کی باتیں شیخ صاحب کی تسلی کے لئے کافی نہیں تھیں۔ اُن کا رونا کسی طرح تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔

جب رو رو کر اُن کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہُوا تو اُنہوں نے بیٹے اور بہو سے کہا کہ وہ اُن سے ایک عہد چاہتے ہیں۔ بیٹے اور بہو نے بیک زبان کہا کہ اُن کا ہر لفظ اُن کے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ جو بھی کہیں گے وہ دل وجان سے اُس پر عمل کریں گے۔

بیٹے اور بہو کی بات سُن کر شیخ صاحب نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور پھر اُن سے کہا کہ وہ اُن سے وعدہ کریں کہ وہ اپنے ہسپتال میں چاہے کیسی بھی صورت حال ہو کوئی حمل نہیں گرائیں گے۔

بیٹے اور بہو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اُنہوں نے ہلکے سے تذبذب کے ساتھ شیخ صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے ہسپتال میں کوئی حمل نہیں گرائیں گے۔

بیٹے اور بہو کے وعدے سے شیخ صاحب کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لگتا تھا اُن کے دل پر ایک بوجھ تھا جو اُتر گیا ہے۔

اُنہوں نے پیار سے اپنے پوتے کو بازوؤں میں اٹھایا۔ پیار سے اس کا ماتھا چوما۔ اُس کے ساتھ کھیلتے ہوئے اُسے ہوا میں اُچھالنے لگے۔

درخت پر رکھی آنکھیں

اُسے کس کی تلاش تھی وہ نہیں جانتا تھا۔ مسجدیں، مندر، شراب خانے، ڈسکو اور سمندروں کے برہنہ ساحل، وہ اس تلاش میں کہاں کہاں نہیں گیا تھا۔

اُسے لگتا اُس کی آنکھیں درخت پر رکھی ہیں جو ہمہ وقت چاروں طرف گردش کرتی رہتی ہیں تاکہ کوئی آشنا چہرہ، کوئی آشنا آواز، کوئی آشنا خوشبو ایک احساس بن کر اُس کے قریب آئے اور وہ اُس سے لپٹ کر ہمیشہ کے لئے دھویں میں تبدیل ہو جائے۔

اُس نے کمپیوٹر آن کیا تو اُس کے میل باکس میں ہزاروں اِی میلیں اُس کی منتظر تھیں۔ اُس نے یہ دیکھے بغیر کہ کونسی اِی میل کس نے بھجوائی ہے ایک بٹن دبا کر ساری اِی میلیں صاف کر دیں۔

پھر اُس نے فیس بک پر اپنا نام ڈالا تو دوستی کی کتنی درخواستیں، کتنے پیغامات اور کتنے تبصرے اُس کے منتظر تھے۔

سب ان جانے لوگ۔ اُس نے دوستی کی درخواستوں پر نظریں دوڑائی تو سارے نام اجنبی اور تصویریں اَن جانے لوگوں کی تھیں۔

ناموں سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوستی کے طلب گار کسی ایک کلچر سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کوئی چینی نام تھا، کوئی جاپانی، کوئی انگلستانی، کوئی ہندوستانی، کوئی پاکستانی اور۔۔۔۔۔

تصویریں دیکھ کر لگتا تھا کہ جن لوگوں کی آنکھیں درختوں پر رکھی تھیں وہ کسی خاص عمر یا جنس سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

مرد، عورتیں، لڑکیاں، لڑکے، بچے اور کچھ جانور۔

اب ظاہر ہے جانوروں نے فیس بک پر دوستی کی درخواست تو نہیں کی تھی۔ بس کچھ انسانوں نے جانوروں کی تصویریں استعمال کی تھیں۔

تصویروں سے یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ جن لوگوں نے جانوروں کی تصویریں استعمال کی تھیں وہ جانور اُن کی فطرت کی نمائندگی بھی کرتے تھے یا نہیں۔

اُسے محسوس ہوا کہ صرف اُسی کی آنکھیں درخت پر نہیں رکھی تھیں بلکہ اور ہزاروں لوگوں کی آنکھیں بھی درختوں پر رکھی ہیں جو ہمہ وقت ان جانی فضاؤں میں گردش کرتی رہتی ہیں تاکہ کہیں کوئی آشنا چہرہ، آشنا آواز یا آشنا خوشبو احساس بن کر قریب آئے تو وہ فوراً اُس سے لپٹ جائیں۔

ہزاروں برس تک مسجدوں، مندروں، شراب خانوں، رقص گاہوں اور سمندروں کے برہنہ ساحلوں پر بے مقصد گھومنا اور آوارہ پھرنا آسان کام نہیں ہے۔

کہاں تک کوئی مولویوں کے خواب آور وعظ اور پنڈتوں کے بھنبھناتے اشلوک، پیپ بہتے کانوں سے سنے۔ ساقیوں کی مسکراہٹیں، تھرتھراتے ہوئے جسموں کے سایوں کی طرح ابھرتے اور ڈوبتے خطوط اور برہنہ ساحلوں پر بکھری پانی کے قطرے کے لئے پیاسی سیپیوں کے مناظر زخمی آنکھوں سے دیکھے۔

"کون ہو بھائی؟"

دور درخت پر رکھی آنکھوں سے آواز آئی۔

"تم کون ہو۔۔۔۔۔؟"

"دیکھو میری جان پر بنی ہے۔ میری مدد کرو۔"

"تم ہو کون اور کہاں ہو۔۔۔۔۔۔۔؟"

"میں اسلام آباد میں ہوں۔۔۔۔۔ سارے شہر میں اپنے ننگے شریر کے ساتھ گھوم پھر کر آیا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی مرد نہیں ملا۔۔۔۔"

فیس بک پر صرف وہی نہیں بلکہ اور دسیوں لوگ اپنی آنکھیں درختوں پر رکھے کسی آشنا چہرے، کسی آشنا آواز یا کسی آشنا خوشبو کے منتظر تھے۔

اُس نے گھبرا کر کمپیوٹر بند کیا اور کاندھے پر تولیہ رکھ کر سڑکوں پر آوارگی کے لئے نکل گیا۔ سان فرانسسکو اسلام آباد سے بہتر ثابت ہوا۔

چند لمحوں میں بحرالکاہل کی موجوں سے ٹکرا کر آتی ہواؤں سے اُس کے بھورے بال اُس کے چہرے پر پھیل گئے۔

وہ اسلام آباد میں بھٹکنے والی بدنصیب روح سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ اُسے کسی آشنا چہرے، آشنا آواز، یا آشنا خوشبو کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بغیر آشنا چہرے، بغیر آشنا آواز، بغیر آشنا خوشبو سے لپٹ گیا۔ یہاں تک کہ اُس کا جسم پسینے سے شرابُور ہو گیا۔

سان فرانسسکو تو ایسے چہروں، آوازوں اور خوشبوؤں کا جنگل ہے۔ نہ وقت کی قید۔ نہ دن اور رات کا بندھن۔

مہربان بحرالکاہل کی لہروں سے ٹکرا کر آتی ہواؤں سے اُس کے چہرے پر پھیلتے بھورے بالوں سے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔

اُس نے تولیہ اپنے بالوں کے گرد لپیٹ لیا۔ پسینے کے قطرے تولیے میں جذب ہو گئے۔ اُس نے بالوں کو دوبارہ تولیے سے آزاد کیا تو ہوا سے لہراتے بالوں کی جڑوں میں اُسے ہلکی سی خنکی کا احساس ہوا۔

شہر میں رات صحرائی غولوں کی طرح ایک بلڈنگ سے دوسری بلڈنگ پر چھلانگیں لگا رہی تھی۔ ہر چھلانگ کے ساتھ وہ اپنا روپ بدلتی لیکن وہ تولیہ کندھوں پر رکھے بحرالکاہل کے برہنہ ساحل کی طرف چلتا رہا۔ اُس نے دیکھا راستے میں پڑنے والے چرچ کے تکونی مینار پر گڑے کراس پر لٹکی یسوع کی مورتی اُلٹی ہو چکی تھی۔ اُس نے مسکرا کر یسوع کی اُلٹی مورتی کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

چرچ سے تھوڑی دور نائٹ کلب سے شراب میں دھت لڑکے اور لڑکیاں باہر نکل رہے تھے۔ کسی نے اپنی پیٹھ ننگی کر رکھی تھی اور کسی نے سر کے بیچوں بیچ رنگ دار بالوں کو سرکنڈوں کی طرح کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ کافی دیر تک اِسی طرح شہر میں گھومتا رہا۔

نا آشنا چہرہ، نا آشنا آواز اور نا آشنا خوشبو ابھی تک اُس کے ساتھ تھے۔ لیکن اب وہ خواہش کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔

درخت پر رکھی اُس کی آنکھوں میں تھکن کے اثرات نمایاں تھے۔ اُسے لگا اُس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں امڈنے والے خون سے سُرخ ہو رہی ہیں۔

اُس نے درخت سے اٹھا کر اپنی آنکھیں تولیے سے صاف کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے تولیے پر خون کے دھبے دکھائی دیئے۔

وہ تولیے پر خون کے دھبے دیکھنے کے باوجود چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کے پیروں تلے ساحل کی ٹھنڈی ریت کے گیلے بوسوں کے لمس کی سرسراہٹ اس کے بدن میں بھر گئی۔

اُسے لگا ایک نا آشنا خوشبو اب بھی اس کے شریر سے لپٹی ہے۔

اس نے برہنہ ساحل پر کھڑے ہو کر بحرالکاہل کی پُرشور لہروں کی طرف دیکھا۔ رات کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر برہنہ چاند پورے وجود کے ساتھ لہروں میں غسل کر رہا تھا۔

اُس نے درخت سے اٹھا کر اپنی آنکھیں اپنے حلقوں میں رکھیں اور باقی ہزاروں سیپیوں کی طرح پانی کے قطرے کی امید میں برہنہ ساحل پر لیٹ گیا۔

سرخ گلاب

میں تمہارے بارے میں بہت سوچتا ہوں۔ اتنا سوچتا ہوں کہ ایک لمحہ تمہاری سوچوں سے غافل نہیں رہتا۔ مجھے تمہارے بارے میں سوچنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں جب تمہارے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے میں تمہاری طرف دیکھتا ہی رہوں۔

جب تم آنکھیں بند کئے لیٹی ہوتی ہو تو مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ اتنی اچھی کہ میں چاہوں بھی تو تمہارے چہرے سے آنکھیں نہیں ہٹا سکتا۔ پھر تم آنکھیں کھول دیتی ہو۔ آنکھیں کھولتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ میں سوچنا شروع ہو جاتا ہوں کہ تم میں مجھے سب سے اچھی چیز کیا لگتی ہے۔ تمہاری آنکھیں۔ تمہارے ابرو۔ تمہارے بال۔ تمہارے کان۔ تمہاری ناک۔ میں فیصلہ نہیں کر پاتا۔ بس تمہاری طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آگے بڑھ کر تمہارے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لوں۔ تمہارے بالوں کا ریشمی لمس میرے ہاتھوں میں سرسراہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ حالانکہ ابھی تمہارے بال میرے ہاتھوں کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں۔

تمہارے ہونٹ۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی۔ انہیں دیکھ کر میں کیا محسوس کرتا ہوں۔ ان کی ہلکی سی جنبش مجھے زندگی دے جاتی ہے اور ہلکی سی جنبش موت۔ اِس زندگی میں بھی ایک لذت ہے اور موت میں بھی۔ میں فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کس چیز کی خواہش کروں زندگی کی یا موت کی۔

جانتی ہو تم جب میرا نام پکارنے کے لئے الف کہتی ہو تو تمہارے لبوں اور ٹھوڑی کی حرکت سے میری کائنات ہل جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میرے ارد گرد ساری کائنات تمہارے ایک لفظ الف کی ادائیگی کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔

میرا جی چاہتا ہے میں تمہارے ہونٹوں کی اِس حرکت پر قربان ہو جاؤں۔ میں بہت مشکل سے خود کو سنبھالتا ہوں۔

ابھی میں تمہارے ہونٹوں سے ادا ہونے والے الف کی لذت سے رنگ و نور کی بارش میں شرابُور ہوتا ہوں کہ تمہارے ہونٹ تھوڑے سے کھلتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری زبان ش کہنے کے لئے تمہارے تالو کی طرف حرکت کرتی ہے۔

تمہاری زبان کی تمہارے ہلکے سے کھلے ہونٹوں کے پیچھے تالو کی طرف حرکت سے مجھ پر ایک نشے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

تمہارے بال میرے ہاتھوں سے ریشم کے دھاگوں کی طرح پھسل جاتے ہیں۔ میں آگے بڑھ کر دوبارہ اُنہیں اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہوں لیکن وہ ایک عجیب و غریب خوشبو میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ خوشبو کو پکڑنا میرے لئے بالکل ممکن نہیں رہ جاتا۔

میں بار بار کوشش کرتا ہوں کہ تمہارے بالوں کو ہاتھ میں لے کر ان کا لمس محسوس کروں لیکن ایک خوشبو میرے رگ وپے میں پھیل جاتی ہے۔

میں ایک سانپ کی طرف فرش پر لوٹنے لگتا ہوں۔ مجھے سانپ کی طرح فرش پر لوٹنا بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میرا زہر میرے سارے وجود میں نشہ بن کر پھیل گیا ہے۔

کاش اِس کیفیت کو بیان کرنے کی کوئی اور صورت ہوتی۔ میں ابھی اِس کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہوں کہ تمہاری زبان کی نوک "ر" ادا کرنے کے لئے تمہارے ہونٹوں کی طرف ہلکی سی آگے کی طرف حرکت کرتی ہے۔

تمہاری زبان کی یہ حرکت دیکھ کر میرے ہاتھ میرے گریبان تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں دیوانوں کی طرح اپنا گریبان پھاڑ دیتا ہوں۔

تم میری حالت دیکھ کر میرا نام پکارنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہو۔ جب تم میرا نام پکارنے کا ارادہ ترک کرتی ہو قوس قزاح کے رنگ تمہاری آنکھوں میں مسکراہٹ بن کر پھیل جاتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ میں مریم کی مورتی کے سامنے گھٹنے فلور پر رکھے دونوں زانوؤں پر جھکا ہوں۔ مریم میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی۔

فطرت ایسی خوبصورت چیزیں کیسے تخلیق کرتی ہے ؟ میں سوچتا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے سینکڑوں ہزاروں رنگ برنگے پھول لہرانے لگتے ہیں۔

اتنے پیارے رنگ، اتنے دلکش رنگ، میرا دل اُن کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ میں آگے بڑھ کو سرخ گلاب کو بوسہ دیتا ہوں۔

تم آنکھیں کھول دیتی ہو۔ خوبصورت آنکھیں۔ اتنی خوبصورت کہ اُن کے حسن کو بیان کرنے کے لئے ایک ایک کر کے سارے لفظ میرے ذہن سے پھسل جاتے ہیں۔

میں اُن لفظوں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ بالکل ایک بچے کے طرح۔ ایک بچہ جو کسی گارڈن میں تتلیوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔

میں تم سے کہتا ہوں۔ ابھی تم نے میرے نام کے پہلے تین حرف ادا کئے تھے۔ ابھی تم نے صرف " ا" " ش" اور "ر" کہا تھا۔ اگلے حرف ادا کر کے میرا نام مکمل کر دو۔

تم کہتی ہو۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ "ا" "ش" اور " ر" سے تمہاری جو حالت ہوئی ہے میں اِس سے خوف زدہ ہو گئی ہوں۔

اتنا کہہ کر وہ اداس ہو جاتی ہے۔ اُس کو اداس دیکھ کر میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی نرم و نازک انگلیوں کی پوروں سے میرے ٹوٹے ہوے دل کے ٹکڑے ایک ایک کر کے اکٹھے کرتی ہے۔ اُس کی انگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں۔

وہ اپنی زخمی انگلیوں سے بہتے خون سے میرے ننگے جسم پر نقش و نگار بناتے ہوئے کہتی ہے:

"میں نہیں جانتی تمہاری دو بے قرار آنکھیں مجھ میں کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ سرخ گلاب کا پھول تمہارے لئے ہے۔

میں بے اختیار، دیوانوں کی طرح، سرخ گلاب کو چومنے لگتا ہوں۔ اُس کے بال ریشمی دھاگوں کی طرح میری ہتھیلی سے پھر پھسل جاتے ہیں۔

گول میز کانفرنس

صدر کانفرنس نے کانفرنس کا آغاز کرتے ہوئے گزشتہ ہفتے کی بحث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ گزشتہ ہفتے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سیاسی آزادی معاشی آزادی سے زیادہ ضروری ہے۔

ابھی صدرِ کانفرنس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسرا شریکِ کانفرنس بول اٹھا: "نہیں یہ سچ نہیں ہے۔ گزشتہ ہفتے ہم کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے۔ ابھی بحث جاری تھی کہ کانفرنس کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ ابھی ہم اس بات کا فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ اولیت کسے دی جائے۔ سیاسی آزادی کو یا معاشی آزادی کو۔

تیسرے شریکِ کانفرنس نے یہ کہہ کر صدرِ کانفرنس اور دوسرے شریکِ کانفرنس کی بات پر کلہاڑی چلا دی کہ اصل چیز نہ معاشی آزادی ہے نہ سیاسی آزادی بلکہ اصل چیز ذہنی آزادی ہے۔ تیسرے شریکِ کانفرنس کا اتنا کہنا تھا کہ سب میں گرما گرم بحث چھڑ گئی۔

صدرِ کانفرنس۔ "اب تم یہ بتاؤ ذہنی آزادی سے تمہاری کیا مراد ہے۔ اور تم اسے معاشی اور سیاسی آزادی پر کیسے ترجیح دیتے ہو۔"

"دیکھو صاحب تمہیں پیٹ بھر کھانا میسر ہو، ووٹ دینے کی اجازت ہو، لیکن تمہیں آزادانہ طور پر سوچنے اور اظہارِ خیال کی اجازت نہ ہو، ہر وقت خیالوں پر کنٹرول کرنے والی پولیس تمہارے پیچھے لگی رہے، تو پیٹ بھر کھانا اور ووٹ دینے کا حق یا اجازت کس کام کے؟" تیسرے شریکِ کانفرنس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"اب یہ خیالوں کو کنٹرول کرنے والی پولیس کہاں سے آگئی؟" دوسرے نے بھناتے ہوئے استفسار کیا۔

صدرِ کانفرنس نے بات دوسری طرف جاتے دیکھی تو کہنے لگے۔۔۔۔"کیا یہ بہتر نہیں کی ہم پہلے معاشی یا سیاسی آزادی کا مسئلہ حل کر لیں اور اِس کے بعد ذہنی آزادی یا کسی اور آزادی کی بات کریں؟"

"صدر صاحب آپ کی بات معقول لگتی ہے۔ پہلے معاشی یا سیاسی آزادی کا جھگڑا ختم ہونا چاہئے اس کے بعد کسی اور آزادی کے بارے میں سوچنا چاہئے۔"

تیسرے نے صدر اور دوسرے شریکِ کانفرنس میں معاشی اور سیاسی آزادی پر اتفاق ہوتے دیکھا تو کہنے لگا۔۔۔"ابھی تو میں نے صرف ذہنی آزادی کی بات کی ہے اور تم نے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا ہے۔ اگر میں نے آزادیِ نسواں کا ذکر چھیڑ دیا تو بات دور تک چلی جائے گی۔ لیکن میں ایسا کروں گا نہیں کیونکہ میرے نزدیک اصل آزادی ذہنی آزادی ہے۔ باقی سب آزادیاں اِس کے ساتھ مشروط ہیں۔ ایک بار ایک قوم کے افراد ذہنی طور پر آزاد ہو جائیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی نہیں کر سکتی۔ پھر وہ ساری آزادیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ معاشی اور سیاسی آزادیاں خود بخود چلی آتی ہیں۔۔۔۔"

تیسرا بول رہا تھا کہ صدرِ کانفرنس اور دوسرے شریکِ کانفرنس نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر دوسرا شریکِ کانفرنس پینترہ بدل کر بولا۔۔۔"اماں یار یہ تم نے ذہنی آزادی کی کیا رٹ لگا رکھی ہے؟ تمام انسان ذہنی طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ کون کسی کو کچھ سوچنے سے روک سکتا ہے۔ سو یہ خیالات کنٹرول کرنے والی پولیس کا ذکر بیچ میں کہاں سے آ گیا۔"

"نہ، نہ، میاں تم ابھی سمجھے نہیں کہ ذہنی آزادی کا سفر کہاں سے اور کیسے شروع ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ تو روزِ آفرینش سے چل پڑا تھا۔ خدا چاہتا تھا کہ وہ ایسے انسان پیدا کرے جو ہر وقت اُس سے خوف زدہ رہیں۔ اُس سے ڈرتے ہوئے اُس کی حمد و ثنا کرتے رہیں۔

جب خدا انسان کے ذہن میں خوف کی چپیں لگا رہا تھا عین اُس وقت شیطان کا دماغ اچانک انگڑائیاں لینے لگا۔ اُسے ایک خوف زدہ انسان ایک آنکھ نہ بھایا۔ اُس نے چاہا کہ انسان آزادی سے جینا سیکھے۔ اِس طرح پہلی آزاد سوچ نے جنم لیا۔ شیطان نے دیکھا کہ اُس کے ایک حرفِ انکار سے امکانات کے اتنے نئے دروازے کھلے کہ شیطان کے لئے اُن کا شمار ممکن نہ رہا۔ انسان یہ ڈرامہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

چنانچہ شیطان کے دیکھا دیکھی انسان نے بھی جسارت کی اور پہلا خدائی حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اُس نے اُس درخت کا پھل کھالیا جس کے قریب جانے سے خدا نے اُسے منع کیا تھا۔

ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کی دیر تھی کہ انسان کے ہر طرف امکانات کے لاکھوں کروڑوں قمقمے جل اٹھے۔ تب سے اب تک سوچ کنٹرول کرنے والی پولیس کے اہل کار طرح طرح کا بھیس بدل کر انسان کی زندگی میں آتے ہیں جو اس کے خیالات کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ کہیں یہ والدِ محترم کی شکل میں آتے ہیں، کہیں ماسٹر صاحب کی شکل میں، کہیں مولوی صاحب کی شکل میں اور کہیں ریاست اور ریاستی اداروں کی شکل میں۔

لیکن انسان کے اندر روزِ آفرینش سے چھپی انرجی ابھی تک ان ڈھکوسلوں سے کنٹرول نہیں ہو پا رہی۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی انسان خیالات کنٹرول کرنے والی پولیس کے سپاہیوں کو جُل دے کر کوئی نہ کوئی ایسا دروازہ کھول دیتا ہے جس سے خیالات کنٹرول کرنے والی قوتیں پریشان ہو جاتی ہیں اور ان کے کارندے خطرے کی بو سونگھ کر فوراً متحرک ہو جاتے ہیں۔"

صدرِ کانفرنس اور دوسرے شریکِ کانفرنس نے تیسرے کی یہ باتیں سُنیں تو پُر تشویش لہجے میں کہنے لگے۔۔۔"یار ہم یہاں معاشی اور سیاسی آزادی پر گفتگو کرنے آئے تھے یہ تم ہمیں کہاں روزِ آفرینش کی

داستانیں سُنانے بیٹھ گئے ہو۔ پتہ نہیں یہ بُری عادت تمہیں کہاں سے پڑی ہے۔ ہم ڈِسکس کچھ اور کرنا چاہتے ہیں تم ہمیں کسی اور ہی دنیا میں لے جاتے ہو۔"

صدرِ کانفرنس اور دوسرا شریکِ کانفرنس تیسرے شریکِ کانفرنس سے سخت ناراض تھے۔ یہ دوسرا ہفتہ جارہا تھا کہ وہ ابھی تک معاشی اور سیاسی آزادی کا مسئلہ حل نہیں کر سکے تھے۔ وہ اس مسئلے پر زیادہ وقت نہیں لگانا چاہتے تھے۔ آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ اس بحث کو سمیٹنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتہ مرغی پہلے یا انڈا پہلے کی بحث میں گزر چکا تھا۔ دوسرے ہفتے کا کانفرنس کا وقت بھی ختم ہوا چاہتا تھا۔

صدرِ کانفرنس اور دوسرے شریکِ کانفرنس نے تیسرے شریکِ کانفرنس کو ایک پیشکش کی۔ اُنہوں نے اُسے کہا اگر وہ فی الحال معاشی اور سیاسی آزادی کی اہمیت کے تعین پر بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو وہ اُس کی ذہنی آزادی کے مسئلے کو بھی قومی ایجنڈے پر ڈالنے پر تیار ہو جائیں گے۔

تیسرا شریک کانفرنس صلح پسند آدمی تھا۔ اُس نے کہا وہ جانتا ہے کہ معاشی اور سیاسی آزادی سے ذہنی آزادی نہیں آتی لیکن ان میں سے کسی ایک آزادی سے انسانوں کی زندگی میں بتدریج بہتری کے امکانات پیدا ہوتے ہیں اس لئے اُسے اُن کی پیشکش قبول ہے۔

اِس اتفاق پر دوسری گول میز کانفرنس ختم ہوئی۔ وہ تینوں اگلے ہفتے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔ تیسرے نے جاتے جاتے کہا:

"تم معاشی اور سیاسی غلامی سے آگے نہیں بڑھنا چاہتے۔ تمہیں ذہنی آزادی تک پہنچنے میں سینکڑوں برس لگیں گے۔ وہ سفر جو روزِ آفرینش شروع ہوا تھا۔ ابھی تک جاری ہے۔ ابھی شیطان اور انسان کو مل کر بہت سا کام کرنا ہے۔ گول میز کانفرنسیں یہ کام نہیں کر سکتیں۔"

آزادی

حاجی رحمت علی دین و دنیا کے اعتبار سے ایک کامیاب آدمی تھے۔ دنیا کے اعتبار سے اِس لئے کہ وہ ایک کھاتے پیتے کاروباری آدمی تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ منڈی میں آڑھت کی دوکان تھی۔ خوب چلتی تھی۔

قسمت سے بیوی بھی بہت سگھڑ ملی تھی جو شکل وصورت کے لحاظ سے خوبصورت تو تھی ہی لیکن عادتوں کی بھی بہت اچھی تھی۔

حاجی رحمت علی کی طرح وہ بھی صوم وصلواۃ کی باقاعدگی سے پابندی کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اوپر تلے دو بیٹے، ایک بیٹی اور پھر ایک بیٹا عطا کیا۔

حاجی رحمت علی اور ان کی بیوی نے سارے بچوں کی دینی اصولوں کی مطابق تربیت کی۔ بچپن سے لیکر جوانی تک تینوں بیٹے اور بیٹی سب اسلامی اطوار کے سانچے میں ایسے ڈھلے کہ ہر کوئی حاجی رحمت علی اور اُن کے بچوں پر رشک کرتا۔

حاجی رحمت علی اور اُن کی اہلیہ نے دینی کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی دنیاوی تعلیم پر بھی پوری توجہ دی۔ چنانچہ چاروں بچے جس طرح دینی حسنِ اخلاق کا مرقع تھے اُسی طرح دنیوی اعتبار سے بھی نہایت لائق و فائق تھے۔

وقت کے ساتھ سب کی شادیاں بھی معقول خاندانوں میں ہوئیں۔ ہر ایک نے ایک کامیاب خاندان کی بنیاد رکھی۔

جب تک حاجی رحمت علی اور اُن کی بیگم اپنا دنیوی سفر پورا کر کے ابدی زندگی کی طرف سدھارے اُن کے تینوں بیٹے اور بیٹی اپنے کئی بچے پیدا کر چکے تھے۔

حاجی رحمت علی کی بیٹی کا نام رضیہ تھا۔ رضیہ کی پرورش بھی حاجی صاحب نے باقی بچوں کی طرح کی تھی۔ رضیہ بھی عادتوں اور اطوار کے اعتبار سے اپنے ماں باپ کی شخصیت کا عکس تھی۔ شادی کے بعد اُس کے بھی کئی بچے پیدا ہوئے جن کی اپنے ماں باپ کی طرح اُس نے کامیاب دینی و دنیاوی معیاروں کے مطابق تربیت کی۔ اپنے والدین کی طرح رضیہ کی زندگی میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہاں بچپن سے اُس کے دل میں خاص موقعوں پر ایک خواہش جنم لیتی لیکن وہ اُس خواہش کو اپنے گھریلو ماحول کی وجہ سے دبا دیتی۔ وہ خاص مواقع کیا تھے اور وہ خواہش کیا تھی۔

بس یوں تھا کہ جب کبھی محلے یا رشتہ داروں میں کسی کی شادی ہوتی۔ شادی پر ڈھولک بجتی۔ لڑکیاں بالیاں مل کر شادی کے گیت گاتیں یا رقص کرتیں۔ رضیہ کا جی چاہتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ مل کر گیت گائے اور رقص کرے۔

اُس کے اپنے بھائیوں کی جب شادیاں ہوئی تھیں اُس کے والد مرحوم حاجی رحمت علی نے گھر میں ڈھولک بجانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہاں تک کی اُن کی باراتیں بھی بغیر بینڈ باجے کے گئیں اور وہ کسی ڈھول ڈھمکے کے بغیر دلہنیں بیاہ لائے۔

خود جب رضیہ کی شادی ہوئی نہ اُس کے گھر میں ڈھولک بجی نہ سسرال کے گھر میں۔ نہ اُس کے خاوند نے سہرا باندھا، نہ بینڈ باجے کے ساتھ بارات آئی۔ خاوند نے گلے میں پھولوں کا ہار پہنا، سر پر ٹوپی رکھی، اور بغیر بینڈ باجے کے بارات کے ساتھ اُن کے گھر پہنچا اور اُسے بیاہ کر لے آیا۔

رضیہ نے اپنے ماں باپ کی تربیت کے مطابق اپنے خاوند کے ساتھ زندگی گزاری۔ کئی بچوں کو جنم دیا۔ جیسے اس کی تربیت ہوئی تھی اُس نے اپنے بچوں کی بھی ویسے ہی تربیت کی۔ اپنے بھائیوں کے طرح اپنے بچوں کو بھی دینی اور دنیاوی طور پر کامیاب انسان بنایا۔ وقت پر اُن کی اُسی طرح شادیاں کیں جیسے اُس کے بھائیوں کی یا اُس کی اپنی شادی ہوئی تھی۔

ہر بچے کی شادی کے وقت اُس کے دل میں خواہش جاگی کہ اُس کے گھر میں ڈھولک بجے، لڑکیاں اور بالیاں شادی کے گیت گائیں، رقص کریں، بینڈ باجے کے ساتھ بارات جائے اور وہ اپنی بہوؤں کو ڈولیوں میں بٹھا کر اپنے گھر لائے۔ لیکن اُس کے خاوند نے بھی اُس کے والد حاجی رحمت علی کی طرح نہ کسی بچے کی شادی پر ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی اجازت دی اور نہ بارات کے ساتھ بینڈ باجے کا اہتمام کیا۔ جس طرح اُس کے بھائیوں اور خود اُس کی شادی بغیر باجے گاجے کے ہوئی تھی اُس کے بچوں کی شادیاں بھی ویسے ہی ہوئیں۔

رفتہ رفتہ اُس کے بیٹوں کے ہاں بچے پیدا ہوئے۔ اِس طرح ایک بھرے پُرے گھرانے نے جنم لیا جس میں کئی بیٹے، بہوئیں، اور پوتے پوتیاں تھے۔ جن کی وجہ سے گھر میں خوب رونق تھی۔ سب کی اُس کے مرحوم باپ حاجی رحمت علی اور والدہ مرحومہ کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق تعلیم و تربیت جاری تھی۔

زندگی کی اِسی ہمہ ہمی میں آخر وہ دن بھی آیا کہ رضیہ کا خاوند بیمار ہوا اور چند دن بعد ملکِ عدم سدھارا۔ رضیہ نے اپنے ماں باپ کے سکھائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنے خاوند کی موت کا سوگ منایا۔ فاتحہ کرائی اور قل پڑھائے۔

خاوند کے مرنے کے بعد رضیہ سارے گھر کی توجہ کا مرکز تھی۔ اب سارے گھر کا کاروبار اُس کے گرد گھومتا تھا۔ اپنے بیٹوں کے بچے دیکھ کر رضیہ نہال ہوتی۔ خاوند کے فوت ہونے کے باوجود پوتوں اور پوتیوں کی وجہ سے اُس کا دل بہلا رہتا۔ لیکن اب بھی گلی محلے یا عزیز و اقارب میں سے کسی کے ہاں شادی ہوتی اور وہاں ڈھولک بجتی، گیت گائے جاتے، رقص ہوتا تو رضیہ کا جی چاہتا کہ وہ لڑکیوں اور بالیوں کے ساتھ ڈھولک پر بیٹھ کر شادی کے گیت گائے اور رقص کرے۔ لیکن وہ اپنے ماں باپ کے سکھائے اصولوں کی وجہ سے اب بھی اس خواہش کی تکمیل سے حذر کرتی۔

زندگی کے اِس سفر میں آخر وہ وقت بھی آیا کہ رضیہ کی طبعیت خراب رہنے لگی۔ بیماری کی وجہ سے اُس کی صحت دن بدن گرنے لگی۔ یہاں تک کہ اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گی۔

ایک دن اُس نے اپنے بیٹوں میں سے ایک کے ساتھ ایک عجیب سی خواہش کا اظہار کیا۔ اُس نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے لئے بازار سے شادی کے گیتوں کا کیسٹ خرید کر لائے۔ رضیہ کے کہنے کے مطابق اُس کا سعادت مند بیٹا بازار گیا اور شادی کے گیتوں کا کیسٹ خرید لایا۔

وہ کیسٹ کے ساتھ بازار سے واپس لوٹا تو رضیہ نے اُسے کہا کہ وہ کیسٹ کیسٹ پلییئر میں لگا کر بجائے۔ بیٹے نے ماں کے حکم کے مطابق کیسٹ کیسٹ پلییئر میں لگا کر اُسے آن کر دیا۔ کیسٹ بجنا شروع ہوا تو شادی کے گیتوں کی صدا سارے گھر میں گونجنے لگی۔

شادی کے گیتوں کی آواز سُن کر رضیہ کے سب بیٹے، بہوئیں، پوتے اور پوتیاں اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ نحیف نزار بدن کے ساتھ بستر سے اُٹھی۔ اُس کا کمزور بدن شادی کے گیت کے بولوں کے ساتھ دھیرے دھیرے حرکت کرنے لگا۔ جب تک کیسٹ بجتا رہا۔ وہ گیت کے بول دہراتی اور ساتھ ہولے ہولے رقص کرتی رہی۔

سب افراد خانہ اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پوتے پوتیاں دادی کو گیت الاپتے اور رقص کرتے دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔

اِس سے پہلے کہ شادی کے گیتوں کا کیسٹ ختم ہوتا رضیہ گیت کے بول دہراتی اور رقص کرتی لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی۔ فرش پر گرتے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اِس طرح موت سے پہلے رضیہ نے نہ صرف اپنی خواہش پوری کی بلکہ اُس نے حاجی رحمت علی کے اُن اصولوں سے بھی آزادی حاصل کر لی جن پر خود اُس کی اور اُس کے بچوں کی تربیت ہوئی تھی۔

ردّی کاغذ کا ٹکڑا

کیفے کھچا کھچ لوگوں سے بھرا تھا۔ ہر طرح کے لوگ کیفے میں بیٹھے چائے، کافی اور اپنی پسند کے مشروب پی رہے تھے۔ کیفے میں تمباکو نوشی کی اجازت تھی۔ اس لئے کیفے کی ساری فضا سگریٹوں کے دھویں سے بھری تھی۔

وہ بہت دیر سے کیفے میں بیٹھا چائے پر چائے اور سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔ متواتر سگریٹ پینے کی وجہ سے اُس کے ارد گرد اتنا دھواں اکٹھا ہو چکا تھا کہ اُس کا چہرہ تقریباً دھویں میں چھپ چکا تھا۔ کیفے میں بیٹھے سب لوگوں کی نظریں اُس کی طرف تھیں۔

رات دس بجے کے قریب کیفے کے مالک نے کیفے بند ہونے کی صدا لگائی تو اُس نے سگریٹوں کے پیکٹ سے آخری سگریٹ نکال کر سلگانے کی کوشش کی۔ اُس نے لائیٹر ہاتھوں میں تھام کر بار بار اُس کا چھوٹا سا پہیہ گھمایا لیکن چقماق کا پتھر ایک چھوٹی سی چنگاری کو شعلے میں نہ بدل سکا۔ اُس نے لائیٹر سے مایوس ہو کر آخری سگریٹ پیکٹ میں واپس رکھی اور زیر لب بڑبڑایا:

"اِس کمبخت لائیٹر میں بھی گیس ابھی ختم ہونا تھی۔" مسلسل چائے اور سگریٹ پینے کی وجہ سے اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

کیفے کا مالک اُسے کئی سالوں سے جانتا تھا۔ جب سارے گاہک جا چکے تو وہ آ کر اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ کیفے میں کام کرنے والی لڑکی اور لڑکے نے کیفے کی صفائی شروع کر دی۔ کیفے کے مالک نے اُس سے اُس کی سنجیدگی، خاموشی اور اُداسی کا سبب پوچھا۔

وہ سگریٹوں کے دھویں میں ڈوبا کیفے کے مالک کے سوال پر ایسے چونکا جیسے کسی نے اُسے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے جگا دیا ہو۔

کیفے کے مالک نے اُسے گہری سوچوں سے ہوش و حواس میں واپس آتے دیکھا تو کہنے لگا:

"تم آج اتنے اُداس کیوں ہو۔۔۔؟ میں تمہیں کئی سالوں سے جانتا ہوں۔۔۔ تم تقریباً روزانہ کیفے پر آتے ہو۔ چائے اور سگریٹ پیتے ہو لیکن آج تک میں نے تمہیں کبھی اتنا سنجیدہ یا اس قدر اُداس نہیں دیکھا۔۔۔ آخر آج ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟"

کیفے کے مالک کا سوال سُن کر اُس نے ایک طویل سرد آہ بھری لیکن اُس کے کسی سوال کا جواب دینے سے گریز کیا۔

جواب دیتا بھی تو کیا۔ اُسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اُس کی اُداسی اور سنجیدگی کا سبب کیا ہے۔ شاید وہ مڈلائف کرائسس سے گزر رہا تھا۔

وہ اب عمر کے اُس حصے میں تھا جہاں خواہشیں دم توڑنے لگتی ہیں اور ولولے سرد پڑ جاتے ہیں۔ جہاں انسان چند لمحوں کے لئے کسی ٹیلے پر کھڑا ہو کر اپنی زندگی کے ان نشیب و فراز کا جائزہ لیتا ہے جہاں سے گزرتے وقت وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اُسے اس مقام سے گزرنا چاہئے یا نہیں۔

کیفے کے مالک نے اُسے یوں ٹھنڈی آہ بھرتے دیکھا تو کہنے لگا:

"ایسی گہری سوچوں سے آدمی کو گریز کرنا چاہئے جن سے اُسے خود ڈر آنے لگے۔۔۔"

کیفے کے مالک کی بات سن کر آخر وہ اُس سے مخاطب ہوا۔

" شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے لگتا ہے میری زندگی بے معنی ہو چکی ہے۔ مجھے اب نہ کچھ پیچھے نظر آتا ہے نہ آگے۔ میں جتنا زیادہ سوچتا ہوں، زندگی میں تہہ در تہہ چھپی بے مقصدیت مجھ پر اِتنی زیادہ کھلتی جاتی ہے۔۔۔"

کیفے کے مالک نے اُس کی بات سنی تو کہنے لگا:

"یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں۔ یہ ہر مڈل کلاسیے کا مسئلہ ہے۔ وہ جوانی میں بڑے بڑے خواب دیکھتا ہے اور پھر ڈھلتی عمر کے ساتھ جب اُن خوابوں کی تکمیل کی امیدیں چکنا چور ہونے لگتی ہیں تو وہ کرچیاں چنتے چنتے خود کو لہولہان کر لیتا ہے۔

تم بھی آج گزرے لمحوں کے دیئے زخموں سے رِستے خون کو چاٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔"
کیفے کے مالک کی بات سُن کر اُس نے کانپتے ہاتھوں سے دوبارہ پیکٹ سے سگریت نکالا اور ایک بار پھر لائیٹر سے اُسے سلگانے کی کوشش کی لیکن لائیٹر کا چقماق پھر ایک چنگاری چھوڑنے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کیفے کے مالک نے اپنی جیب سے لائیٹر نکال کر اُس کا سگریٹ سلگایا۔
پھر اُس نے بھی اپنی جیب سے سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور دوبارہ اپنے دوست کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے بولا:
"اصل چیز لمحہ موجود کی صدا سننا، اُس کی صحیح تفہیم، اور اُس سے ہم آہنگ رہنا ہے۔ جو لوگ لمحہ موجود کی صدا سنتے اور اُس سے ہم آہنگ رہتے ہیں بڑے سے بڑا زخم اُن کی روح کو گھائل نہیں کر سکتا۔ جو لوگ اِس استعداد سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی لمحے کے چھوٹے سے چھوٹے چیلنج کا سامنا نہیں کر سکتے۔
یہ بھی یاد رہے کہ یہ اصول صرف کسی ایک خاص فرد تک محدود نہیں۔ یہی اصول اقوام پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ جو قومیں لمحے کی صدا سننے اور اُس سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہ بڑے سے بڑے چیلنج سے اِس طرح نبرد آزما ہوتی ہیں کہ ہر نئے چیلنج سے نپٹنے کے بعد اُن کے بانکپن اور نکھار میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔"
اُس نے کیفے کے مالک کی بات سُن کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور کہنے لگا:
"یار تم چائے بیچتے بیچتے فلاسفر کب سے ہو گئے ہو۔ میں سمجھتا تھا تم سارا دن چائے سگریٹ بیچتے ہو اور پیسے اکٹھے کرتے ہو۔ لیکن تمہاری باتوں سے لگتا ہے تم سوچتے بھی ہو۔"
"میں سوچتا ضرور ہوں۔ لیکن تمہاری طرح نہیں۔ تم شاید بھول رہے ہو میں نے بھی تمہاری طرح یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی تھی۔ لیکن میں نے سول سروس کا امتحان دینے کی بجائے یہ کیفے کھولنے کو ترجیح دی۔ اب تم ملازمت سے فارغ ہو کر سارا دن یہاں بیٹھے چائے اور سگریٹ پی کر گزرے لمحوں کی

بے رحمی کا ماتم کرتے رہتے ہو جب کہ میں ہنسی خوش اپنے گاہکوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں زندگی کے آخری لمحے تک یہ شغل اسی جوش و جذبے کے ساتھ جاری رکھ سکتا ہوں۔"

کیفے کے مالک کی بات سن کر اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جب سے یہاں بیٹھا تھا یہ اُس کے چہرے پر پھیلنے والی پہلی مسکان تھی۔

اُس کے چہرے پر پھیلتی مسکان دیکھ کر کیفے کے مالک نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج چائے پیتے اور سگریٹوں کے کش کھینچتے وہ یہیں فوت ہو جائے گا اور اُسے خوامخواہ اُس کے سفر آخرت کا بندوبست کرنا پڑے گا۔

آخر وہ اُس کا دوست تھا۔ چائے سگریٹوں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن وہ ڈیپریشن سے اُس کے کیفے میں فوت ہو جائے یہ اُسے قبول نہیں تھا۔

اُسے مسکراتے دیکھ کر کیفے کے مالک کو اُس کی اور اپنی جوانی کا زمانہ یاد آیا۔ تب وہ دونوں یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر وہ دونوں گھنٹوں انگریزی بولنے کی پریکٹس کرتے۔ اگر کوئی برطانوی یا امریکی سیاح ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو اُسے کسی نہ کسی طرح گھیر لیتے تا کہ اُس کے ساتھ انگریزی بولنے کی پریکٹس کر سکیں۔

اُن دنوں زبان سیکھنے کے جدید ذرائع موجود نہیں تھے۔ اُن کا مشغلہ تھا کہ پڑھائی سے فارغ اوقات میں وہ ہر اُس جگہ جاتے جہاں اُن کی کسی گورے سے ملاقات ہو جائے۔ تب وہ ہر گورے کو برطانوی اور امریکی سمجھتے تھے۔ لیکن جب اُنہیں پتہ چلتا کہ جو گورا اُن کے ہاتھ لگا ہے وہ کسی اور ملک سے تعلق رکھتا ہے اور اُس سے انگریزی بول کر خود اُن کی انگریزی خراب ہو جائے گی تو وہ فوراً اُس سے جان چھڑا لیتے۔

کیفے کے مالک کا نام رضی تھا اور اُس کے دوست کا نام شازی۔ رضی اور شازی اُن کے مختصر نام تھے۔ رضی کا پورا نام رضوان تھا جو مختصر ہو کر رضی رہ گیا تھا۔ شازی کا پورا نام شہزاد تھا جو سُکڑ کر شازی بن گیا تھا۔

یونیورسٹی کے زمانے میں جب بھی رضی اور شازی کے درمیان مستقبل کے بارے میں گفتگو ہوتی رضی ہمیشہ ڈگری لینے کے بعد اپنا کیفے کھولنے کی بات کرتا جب کہ شازی ہمیشہ کہتا کہ وہ مقابلے کا امتحان دے گا اور کامیابی حاصل کر کے سول سروس جوائین کرے گا۔

کیفے کے مالک نے اُسے مسکراتے دیکھا تو اُس نے اُسے وہ دن یاد دلائے جب وہ گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ انگریزی بولنے کے پریکٹس کیا کرتے تھے۔

اُن دنوں کا ذکر آتے ہی اُس کے ارد گرد پھیلے سگریٹوں کے دھویں کے بادل چھٹنے لگے۔ اُس نے کیفے کے مالک سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

"یار رضی۔ دیکھو تم نے کیفے کھولا۔ میں سول سرونٹ بنا۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ شادی اِس لئے نہ کر سکا کہ سول سروس کا زُعم مانع رہا۔ اب نہ بیوی ہے نہ بچے۔

اب میرے پاس اٹھنے بیٹھنے کی دو ہی جگہیں ہیں۔ افسروں کا کلب جہاں سارے ریٹائرڈ افسر رات دن بیٹھے چائے اور سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ یا تمہارا کیفے۔ کلب جانے کی بجائے میں اِس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ دن رات یہاں بیٹھ کر چائے اور سگریٹ پیئوں اور وقت کٹی کروں۔

افسروں کے کلب میں سول سروس کے ساتھی اپنی ملازمت کے زمانے کے قصے سناتے رہتے ہیں جو زیادہ تر اُن کی اناؤں کی شکست وریخت کے گرد گھومتے ہیں۔

میں یہ قصے سُن سُن کر تنگ آ چکا ہوں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ پہلے اُنہوں نے کتنی بار وہ قصے سنائے ہوتے ہیں۔ ہر قصہ اِس طرح سُناتے ہیں جیسے پہلی بار سنا رہے ہوں۔ حالانکہ اُس سے پہلے وہ وہی قصہ کوئی درجن بار دہرا چکے ہوتے ہیں۔

کیفے کے مالک نے اُس کی بات سنی تو کہنے لگا:

"میں روازنہ ایک ہی کام کرتا ہوں۔ تقریباً گاہک بھی وہی ہوتے ہیں۔ وہ دن میں کئی بار کیفے میں آتے ہیں لیکن میں کبھی اُن سے بور نہیں ہوتا۔ وہ جب بھی میرے کیفے میں داخل ہوتے ہیں اُن کے چہرے پر ہمیشہ ایک نئی کہانی لکھی ہوتی ہے۔

چاہے وہ دن میں تین بار کیفے میں آئیں ہر بار اُن کے کا چہرہ ایک نئی کہانی سنا رہا ہوتا ہے۔ کہانی کی جزیات چاہے ایک جیسی ہوں لیکن اُن کے سنانے کا انداز ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔"

کیفے کے مالک کی بات سُن کر ایک بار پھر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اُس نے سگریٹ کا خالی پیکٹ کھولا شاید اُس میں ابھی کوئی سگریٹ موجود ہو۔ لیکن سگریٹوں کا پیکٹ تو کب کا خالی ہو چکا تھا۔ کیفے پر کام کرنے والا لڑکا اور لڑکی بھی کب کے جا چکے تھے۔

کیفے کے مالک نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اُسے سگرٹیٹ پیش کیا۔ اُس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا تو کیفے کے مالک نے اپنے لائیٹر سے اُس کا سگریٹ سلگایا۔

"یار تم نے اچھا کیا۔ کسی نوکری کے چکر میں نہیں پڑے۔ ہم نے مقابلے کا امتحان دیا۔ اچھی نوکریاں کیں۔ سرکاری کام سے دنیا بھر کے ملکوں کے دورے کئے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں رہے۔ بڑے بڑے خوبصورت لوگوں سے ملے۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد لگتا ہے کہ اپنی زندگی ردّی کی ٹوکری میں گرا کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جس کی کوئی افادیت نہیں۔"

کیفے کے مالک کو لگا زندگی بھر کا دکھ اُس کی آواز میں سمٹ آیا ہے۔ سگریٹ کے دھویں کے مرغولوں کے پیچھے اُس کا چہرہ کچھ اور بجھ سا گیا۔

اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر کیفے کی دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "دوست رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

پھر وہ دونوں اٹھے اور کیفے کا دروازہ بند کر کے سر سراتی رات کے سایوں میں ہولے ہولے قدم اٹھاتے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔ وہ تھوڑی دور تک ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیئے لیکن پھر رفتہ رفتہ رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔

کچھ مصنف کے بارے میں

خواجہ اشرف 1951 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پہلے مختصر عرصہ کے لیے اسلام آباد میں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ میں کام کیا۔ پھر پنجاب پبلک سروس کمشن سے انتخاب کے بعد پنجاب میں محکمہِ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور پنجاب کے مختلف کالجوں میں بطورِ لیکچرار پڑھاتے رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دورانِ تعلیم پاکستان کے مختلف اخبارات میں کے ایم اشرف کے نام سے سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

پاکستان میں وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین اوراق اور ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین شب خون میں کئی کہانیاں اور انشائیے لکھے۔

جنرل ضیا الحق کے مارشل لاء کے بعد 1981 میں امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں یونیورسٹی آف فینکس سے ایم بی اے کرنے کے بعد کاروباری دنیا سے وابستگی اختیار کی۔

امریکہ منتقلی کے بعد ضیا دور میں مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد مشرف دور میں بھی جاری رہی۔ اب بھی پاکستان میں جمہوریت کی نشو و نما اور ترویج و اشاعت سے خاص دلچسپی ہے۔

ادب میں ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ ہے۔ زیرِ نظر کہانیوں کی کتاب "مکالمے کا قتل" کے علاوہ وہ تین ناولوں 'مٹی کا بیٹا'، 'نسل سوختہ' اور 'شب گزیدہ سحر' اور کہانیوں کے ایک مجموعے "آئینہ کہانی" کے مصنف ہیں۔

نثری نظموں کا ایک مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ تا حال لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

مصنف کی دیگر کتابیں

مٹی کا بیٹا۔۔۔ناول

ایک اچھوتی اور دلچسپ کہانی جو پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہو کر امریکہ سے ہوتی ہوئی اسی گاؤں میں ختم ہوتی ہے۔ کہانی کا ہیرو ساری عمر اپنے طبعی والد کی تلاش میں کئی دلچسپ مرحلوں سے گزرتا ہے۔ انسانی جذبوں کی عظیم داستان جو انسان دوستی اور انسانی مساوات کا درس دیتی ہے۔ تشدد اور جنگ سے بچنے کا سبق سکھاتی ہے۔ زندگی کے احترام کی تلقین کرتی ہے۔

نسلِ سوختہ۔۔ناول

1947 میں پاکستان بننے سے لیکر 1971 میں قائد اعظم محمد علی جناح کے پاکستان ٹوٹنے کی کہانی۔ پاکستانی سیاست کی بائیبل جس میں اُن کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی وجہ سے 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان دولخت ہُوا۔ پاکستان کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے ممکنہ حل پیش کرتی ہے۔ پاکستانی سیاست میں دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شخص کے لئے اس ناول کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اس کا مطالعہ اُنہیں پاکستان کو ایک نئے پس منظر میں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شب گزیدہ سحر۔۔ناول

شب گزیدہ سحر روسی انقلاب کے بعد سوویت یونین کی تشکیل سے لے کر تحلیل تک کی کہانی ہے جو ایک رومانی داستان کے ذریعے نہ صرف انقلاب کی کہانی سناتی ہے بلکہ سوویت یونین کے عروج وزوال اور آخرِکار تحلیل کے پس پردہ عوامل اور کرداروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ناول اپنے قارئین کو سوویت

یونین کے بارے میں ایک نیا پسِ منظر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر انقلابی کارکن اس ناول کو پڑھ کر انقلاب کے لئے اپنی جدوجہد میں ممکنہ غلطیوں سے خود کو اور تحریک کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

آئینہ کہانی۔۔۔کہانیوں کا مجموعہ

آئینہ کہانی میں مصنف کے قلم سے لکھی گئی چھبیس انوکھی اور دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر کہانی زندگی کے کسی نہ کسی انوکھے رُخ کی نشاندہی کرتی ہے جسے پڑھ کر انسان بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کتاب خریدنے کے لیے مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کریں:

Email: kashraf@ix.netcom.com